شمع کے آنسو

مصنفہ

آر۔ اے۔ شمع

پھول گراں (راولپنڈی)

امانی کمرشل ایجنسی۔ ایچ ۔ ۱۷۴، ساوتھ سرکلر روڈ، راولپنڈی

شمع کے آنسو

مصنف

آر۔ اے شمع

"پھول گراں"

ملنے کا پتہ

امانی کمرشل ایجنسی

ایچ ۱۷۴، ساؤتھ سرکلر روڈ، راول پنڈی

قیمت چار روپیہ

بار اول نومبر ۱۹۵۵ء

سید امان الحق پرنٹر پبلشر نے ملٹری پریس راولپنڈی میں چھپوا کر امانی کمرشل ایجنسی
ساؤتھ سرکلر روڈ راولپنڈی سے شائع کیا۔

عقیدت کے پھول

اپنے جلیل القدر باپ راجہ سکندر خان صاحب "خلد آشیاں" کے نام

جن کا ستارۂ حیات ۱۱ مئی ۱۹۵۲ء بروز سوموار بمقام لاہور غروب ہوا اور جن کی شخصیت کئی خصوصیات فاضلہ اور بہت سی صفات عالیہ سے مملو تھی۔

جن کی سیرت میں خلوص، ہمدردی، محبت، حق پسندی، سخاوت و ریاضت کا ایسا دلکش امتزاج تھا جو بہت کم کسی انسان میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ دنیا کے بے غرض دوست خدا کے مخلص بندے غریب پرور، علم نواز اگرچہ اس دنیا میں موجود نہیں مگر ان کا نام صفحۂ جہاں پر مثل خورشید چمکتا رہے گا۔

اے میری حسین تمناؤں کے امین، میرے آنسوؤں کے پرستار، آپ کی بیش بہا یاد میرا انمول سرمایہ ہے اور آپ کی لافانی صفات میری شمع راہ۔ اے میرے رفیق پدر خلد نشین آج تڑپتے ہوئے دل کے ساتھ فاتحہ شریف کے سدا بہار پھول بھیج رہی ہوں اے بہارِ خلد، اے نسیم کے جھونکو لے جاؤ یہ تحفہ مقدس کیونکہ ہم اس جہاں سے دوسرے جہاں کو یہی بھیج سکتے ہیں۔

خدا مغفرت کرے آپ کی اے مکین جنت

دلفگار

(رشیدہ اختر شمع پھول نگراں)



فہرست!

ہدیۂ تشکّر

محترمہ صفیہ شمیم (ملیح آبادی) جو شاعرِ انقلاب حضرت جوش (ملیح آبادی) کی حقیقی بھانجی ہیں اور جن کا ادبی ماحول مسلسل چار پشتوں سے قائم ہے اور جن کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں نے مِل جُل کر ان کی شاعری کو اس طرح اُبھارا۔ کہ اُنہوں نے شاعری کے اس مقام سے ابتدا کی۔ جو دوسری شعر گو خواتین کا نقطہ انتہا ہوتا ہے۔

میرے لئے کس قدر فخر و مسرت کا باعث ہے کہ پاکستان کی ایک نامور و حوصلہ مند شاعرہ نے میری اس حقیر تصنیف کے لئے اپنا گراں قدر شعر عطا کیا۔

دورِ خزاں کے لطف لے صبحِ بہار کی قسم
آہوں کی سُن کہانیاں چہروں کی تازگی نہ دیکھ

صفیہ شمیم (ملیح آبادی)

شمع کے آنسو!

میں اپنی شاندار کار رولس رائیس میں جارہی تھی۔ حکومت نے دیہات کا افلاس رفع کرنے میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔

جب میں کار سے اُتری تو چوکیداروں نے سلامی دی۔ ہیڈ چوکیدار کو کچھ ہدایتیں دے کر میں ہال میں داخل ہوگئی۔ پورچ سے متصل ایک مرتفع برآمدہ تھا۔ جس کے پاس ایک وسیع ہال تھا جو قیمتی فرنیچر سے مزین تھا۔

برآمدہ کے ایک گوشے سے ایک کشادہ زینہ اوپر کی طرف جاتا تھا اور تمام زینہ عنابی دبیز مخمل سے ڈھکا ہؤا تھا۔ اوپر کے فراخ کمروں کے گوشوں میں الماریوں کے اندر تمام موضوعات پر کئی زبانوں میں بے شمار اعلیٰ درجہ کی کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔ میری خوابگاہ حقیقی معنوں خوابگاہ تھی۔ اس میں داخل ہوتے ہی انسان یہ محسوس کرنے لگتا کہ تمام کلفت و بیداری کی دنیا ختم ہوگئی۔ اور خوابِ نوشیں کے سحر کا آغاز ہوگیا۔

یہاں آکر میرا ارادہ ہؤا کہ ایک ادبی اجتماع کروں اور اپنے بے شمار سرمایہ سے بجائے اپنی ذات پر صرف کرنے کے زکوٰۃ سے انسانوں کی ایک جماعت کی امداد کرنے کے بہتر ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کو اُن کے

حق سے محروم نہ رکھوں۔ پندرہ مارچ کو میں نے جلسہ کا دن مقرر کیا اُس دن "قصرِ منیر" بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تمام میزوں پر سفید میز پوش بچھے تھے۔ صدر دروازہ سے جلسہ گاہ تک "سدا بہار پھولوں" کے سنہری گلدان اور گملے آراستہ کئے دن کو خوب رونق رہی شام کے وقت جلسہ کے اختتام پر میں نے ہر لائن میں ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے چست چالاک فرض شناس نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد دوسرے ممالک میں بھیجنے کے لئے انتخاب کی۔ یونیورسٹیاں، میڈیکل کالج گھریلو صنعت گاہیں تعمیر کرا کر یہ سب فائدے قوم و ملک کو پہنچانے کی تجویز مکمل کی۔ اور کافی رات گئے جب اپنی خواب گاہ میں آئی تو سونے کے بجائے شب ماہتاب کا لطف لینے پائیں باغ میں چلی گئی۔ تمام فضا کو چاندنی نے اپنا سحر پھیلا کر اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ آس پاس کی سبز جھاڑیوں سے جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

بہت دیر چکر لگانے کے بعد خواب گاہ میں آ کر میں نے اُن خوش وضع دریچوں کو کھول دیا جن کا رُخ باغ کی جانب تھا۔

معطر نسیم کی آڑی ترچھی ہو کر آنے والی چاند کی شعاعوں نے مجھے بالکل نہ سونے دیا میں نے اپنی طاؤس کی وضع کی مسہری پر کروٹ بدلی اور سوچا کہ اس چاندنی میں بیٹھ کر کچھ لکھوں۔

مدت کے بعد مجھے ایسا امن بخش ماحول نصیب ہوا تھا جو انسان پر شعریت طاری کر دیتا ہے۔

خواب گاہ سے اُٹھ کر میں کتب خانہ میں آ کر بیٹھ گئی اور ایک لشمی

ربن سے بندھے ہوئے کاغذوں کے پلندہ کو کھولا۔ جس میں میرے "یادگار خطوط" تھے۔ پھر ایک افسانہ پڑھا اور پتا نہیں کن تاثرات میں ڈوب گئی۔ افسانہ نگار کے پروازِ تخیل کی داد دیتے ہوئے اُس کی گہرائیوں میں کھو گئی وہ افسانہ میرے نزدیک ایک افسانہ نہ تھا۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ افسانہ نگار نے میری قلمی دوست کم نصیب شمع کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔

بہت دیر میں ماضی کی گہرائیوں میں حال سطح پر مستقبل کے دھندلکوں میں دیر تک خوابِ زندگی کی تفسیر پڑھتی رہی۔ اور آج سے کئی سال پہلے کی فضا میں جا بسی۔ رات بادلوں میں لپٹی ہوئی تھی اور چاندنی ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے چاند کہیں بہت دور دوسرے آسمانوں پر چمک رہا ہے اور اس کا ہلکا سا پرتو اس دنیا کو منور کر رہا ہے۔

خیالات کے جال میں گرفتار بہت دیر تک سوچتی رہی کہ یہ دنیا اور اس کی عارضی رنگینیاں سب ایک خواب ہیں پلک جھپکی اور سب محفل درہم برہم زندگی کے جگمگاتے ستارے جب موت کے سیاہ بادلوں میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بوڑھا آسمان ہر روز یہی کھیل کھیلتا ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل!!

ملک کے رہنما جنہیں رہنمائی کا دعویٰ ہے یوں ہی اپنے خیالوں میں اُلجھتے رہیں گے اور اس دھرتی کے بسنے والے بچارے غریب دُکھی انسان ایک ایک دانہ کے لئے ترستے اپنی زندگی کی لاش پر آنسو بہاتے اور

خودداری کو غلامی کی چکی میں پیستے رہیں گے۔ انہیں خیالات میں مستغرق جب میں دریچہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو دیکھا مشرق کی سمت سے افق زریں ہوگیا تھا سنہری روشنی میں درختوں کے پتے ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے ہوا تازگی اور رعنائیوں سے معمور تھی مگر میری طبیعت مائل بہ اضطراب!!

مجھے اپنے بچپن کے ایام یاد آگئے میری آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کے پچھلے سال کے خوشگوار مناظر پھرنے لگے۔ جب میں اور شمع بغداد کی شہزادیوں کی طرح ریاست "گل افشاں" میں باغوں سے پھول چنا کرتی تھی اور وہاں کی حسین سرزمین کے جنگلوں میں ہرنوں کا شکار کھیلا کرتی تھیں۔

شمع شمالی ہند کے ایک مقتدر خاندان سے متعلق تھی۔ اس کا باپ ریاست میں کسی ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ ماں کی جانب سے اُسے ہندوستانی شریف گھرانے کی مسلمان عورتوں کی خصوصیات ملی تھیں اور باپ کی طرف سے دلیری، ذہانت حصّہ میں آئی تھی۔

میں اپنے باپ کے ساتھ نو سال تک دنیا کا دورہ کرتی رہی چار سال ٹرکی میں رہی دو سال امریکہ اور انگلستان، ایک سال مصر میں دو سال سوئیٹزرلینڈ، ناروے، ڈنمارک کا چکر کاٹ کر اپنی ریاست گل افشاں میں واپس آئی تو یہاں آکر اپنی سالگرہ کے دن پھر شمع کو دیکھا میری بے شمار دولت جس کی میں اپنے باپ کی تنہا اولاد ہونے کے باعث مالک ہوں اُس سے کئی یتیم خانے قائم کئے جس سے بہت سے نادار طلباء، وظیفے پا رہے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کئی مستحق امداد

قومی ادارے چل رہے ہیں بے شمار مفلس کسانوں کے لگان ادا کئے جاتے ہیں۔ اسکول، شفاخانے، اپاہج گھروں کو چندہ دیتی ہوں۔ لیکن میں اس کے باوجود بھی یہی سمجھتی ہوں کہ میری دولت کا صحیح مصرف نہیں ہوا۔

باپ کی پنشن کے بعد شمع اپنے گاؤں چلی گئی جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنے آئی جب کہ میرے پاس چند بڑے تاجر معہ اپنی بیگمات کے موجود تھے۔ اور ہمارے درمیان ایک تجارتی بحث تھی۔ لیکن شمع کے آنے پر یہ بحث ادبی گفتگو سے بدل گئی جس میں شمع نے خصوصیت سے حصہ لیا۔ وہ کہنے لگی دراصل ادب وہی ہے۔ جو جمود کو توڑ کر زندگی میں حرکت پیدا کرے۔

شمع کا خیال تھا کہ اگر ہم اپنے ادب میں دوسرے زندہ رہنے والے ادب کی خصوصیات پیدا کریں تو اردو دنیا کی بڑی سے بڑی زبان سے بلند ہو سکتی ہے۔

وہ کہنے لگی ہمارے ابنائے وطن پر غیر قوموں کی تہذیب بہت تیزی سے اثر انداز ہوتی جا رہی ہے۔

ہمارا ادب، ثقافت، تہذیب اور طرزِ فکر باہر کے اثرات میں ڈوب رہا ہے۔ اور ادب و صحافت میں اتنی قوت ہے کہ وہ قوموں کی ذہنیت بدل سکتی ہے۔ ہمیں بتانا چاہیئے کہ اسلام رسولِ خدا کی رحلت کے بعد ختم نہیں ہوا تھا بلکہ زندہ ہوا تھا۔ شہادت حسین کے ساتھ اسلام شہید نہیں ہو گیا تھا بلکہ تازہ ہوا تھا کفر کی

آندھیاں چراغِ ابراہیمی کو گل نہ کر سکی تھیں۔

اُس کا خیال تھا کہ اب ہم نے اپنی قوم کی رگوں میں حوصلہ کا خون اور اُمید کی حرارت پیدا کر لی ہے۔ کیونکہ یہی چیزیں حرکت وعمل کی جان ہیں۔

شمع بے ساختگی میں یہ کہہ رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر "آغا سلیم" اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیں تو یہ دُرِّ نایاب ایک شمع روشن کی طرح عالمِ اسلام کو منوّر کرے۔

میں انہی خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی کہ بجلی گل ہو گئی۔ اور تاریکی ہو جانے سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور چاندی کے وہ بڑے بڑے گلدان جن میں صبح کو نیلوفر نے میری وارفتگیٔ شوق کا اندازہ کرتے ہوئے نرگس کے پھول جابجا کمروں کے کونوں، دریچوں کے کناروں پر سجا دیئے تھے میری آنکھوں سے روپوش ہو گئے۔ اور میں گھبرا گئی۔

کمرہ سے باہر جانے کو جب میں اُٹھی تو کنیزوں نے ادب سے میرے لباس کے کونے سنبھالے اور خواصوں نے سیڑھیوں پر عرق پاشی کی۔ جب میں ہال میں داخل ہوئی تو سب مہمان جمع ہو چکے تھے۔ اس گہما گہمی میں مجھے مطلق خیال نہ رہا۔ کہ شمع صبح اپنے گاؤں چلی جائے گی۔ میں اُسے خدا حافظ کہہ دیتی۔

کاش! اس وقت میں محسوس کر سکتی اپنے وطن کی تنگ متعفن مکانوں کی اندھیری فضاؤں کو دیکھ سکتی کہ ایک بے زبان دوشیزہ

کو کس عفریت کے حوالے کیا جاتا ہے۔ جو اُس کی رگ رگ سے زندگی کا خون چوس لے گی۔

آہ! وہ نامراد دوشیزہ چاہتی تھی کہ فطرت کے اُصولوں پر زندگی بسر کروں مگر سماج کے قوانین نے اُس کے عزم کو زندہ درگور کر دیا۔ اُس کی خودداری اور بلندی کو رسوم کی خاطر دفن کر دیا!!

مجلس برخاست ہونے کے بعد میں اپنی دلفریب "خواب گاہ" میں آئی اور مسہری پر دراز ہو گئی۔ دُور افق سے چاند نکل رہا تھا۔ سب دریچوں پر یاسمین کی کلیوں کے پردے پڑے تھے جن کی مہک سے خواب گاہ معطر تھی۔ اور ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے فردوسی حُوریں اپنی لطیف پوشاک میں اُڑ رہی ہیں۔ چاند کی روشنی میں یاسمیں کا عکس کانپ رہا تھا۔

رات بہت دیر جاگنے سے صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ جلدی سے تمام آرائش سے مزین ہو کر میز کے قریب جا بیٹھی جہاں بہت سے ٹائپ کیے ہوئے کاغذات پڑے تھے۔ اتنے میں فردوسی کمرے میں داخل ہوا۔ اور تسنیم نے میرا زرتار دوپٹہ میرے سر پر ڈال دیا۔

میں ایک رسالہ اجرا کرنے والی تھی اور فردوسی کو صحافت کا تجربہ تھا۔ میں اُس سے ماہنامہ کے متعلق کچھ مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ تین گھنٹے تبادلہ خیالات کے بعد میں "ایوانِ رفعت" کے عقب والے باغ میں گئی۔ جس کے گرد مہندی کی بہت اونچی دیوار ہے اور حاشئے

پر پھولوں کے پودے لہلہا رہے ہیں۔

جب میں وہاں گئی تو فوارے کے قریب سنگ مرمر کے چبوترے پر کوثر اور صنوبر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ کوثر نے آگے بڑھ کر یاسمین کی کلیوں کی شال میرے کاندھوں پر ڈال دی صنوبر نے میرا زرتار دوپٹہ ہاتھوں پر تھام کر "قصرِ جمیل" کی طرف چلی گئی اور مجھے میرا ذوقِ شمیم پھولوں کے کنج میں لے گیا۔

سنہری کمخواب میں لپٹا ہوا ستار کھول کر کوثر نے میرے ہاتھوں میں دے دیا اور میں نے اپنا پسندیدہ نغمہ ستار پر چھیڑ دیا۔ نغمہ تڑپ تڑپ کر باہر نکلنے لگا۔ کبھی سُر مدھم پڑ جاتے جیسے ان پر سکوت طاری ہے۔ اور کبھی ہچکیاں سی لینے لگتے گویا جان توڑ رہے ہیں اور کبھی ہر چیز پر چھانے لگتے۔ تمام فضا ساکت وصامت تھی اور مسلسل چلنے والی ہوا کا سانس اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ عالم خیال میں مجھے اس ستار پر شمع کی اُنگلیاں چلتی نظر آئیں۔ اس فن میں شمع کو قدرتی مہارت تھی۔ حالانکہ اُس کا خاندان فن موسیقی اور تعلیم نسواں کے سخت خلاف تھا وہ اپنی خواتین کو پردہ کی بے جا قید اور رواج کی زنجیروں میں بُری طرح اسیر کئے ہوئے تھے۔ مجھے شمع کی ذات، اُس کا کھویا سا انداز، اُس کی خوبصورت مخمور آنکھیں، اُس کا ملجگا سا لباس جس میں اُس کا جسم نور کی طرح چمکتا تھا۔ بہت مرغوب تھا۔

شمع کی یاد آنے پر میں نے کوثر کو شمع کے بلانے کو کہا۔ مگر تسنیم نے

بتایا۔ کہ وہ علی الصبح اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئی ہے۔ جانے سے پہلے وہ "ایوانِ رفعت" میں آئی تھی۔ لیکن آپ اُس وقت محوِ خواب تھیں۔

تسنیم کہنے لگی اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ مگر وہ ایک باوقار انداز سے آنسوؤں کو آنکھوں میں خشک کر رہی تھی اور اس انتہائی ضبط و تحمل کے باوجود وہ تھر کی ایک پتلی بنی ہوئی تھی میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ ایک بے نیازانہ ادائے تبسم کے ساتھ بغیر کوئی بات کئے قصرِ جمیل سے ہو کر چلی گئی۔

کہاں چلی گئی؟ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

اپنے گاؤں۔ کوثر نے جواب دیا۔

آج وہی ستار انگلیوں کو ذِرا ... معلوم ہو رہی تھی اور ہونٹ اس سے بھی زیادہ بوجھل۔ میں خاموش ہو گئی اور وہیں بیٹھ کر بلبل کی نغمہ سرائی سُنتی رہی۔ جس کے پروں میں آفتاب نے نئے نئے رنگ پیدا کر دیئے تھے۔ اور بہتے ہوئے پانی کو اس کی تیز کرنوں نے چمکا دیا تھا۔

مالی نے آکر مجھے پودوں کی نئی بلٹیاں پہنچنے کی اطلاع دی اور میں اُن پودوں کو مناسب جگہ لگوانے کے لئے ادھر چلی گئی۔ سب پودوں کو علی الترتیب حسین وضع سے لگوایا اور پھر اپنی مصروفیتوں میں مصروف ہو گئی۔

زرد چاند آسمان کے نیلگوں کناروں کو جو اس وقت سیاہی میں تبدیل ہو چکے تھے چوم رہا تھا اور اس کی زرد نار کرنیں کائنات کو چمکا

رہی تھیں۔

کہکشاں کسی ہار کے موتیوں کی طرح آسمان پر بکھری ہوئی تھی باوجود سخت تھکاوٹ کے میں اس شاعرانہ فضا میں نہ سو سکی۔ کیونکہ موسم گل کی پرستار، شعریت کی شیدائی بلبل رات کی خاموشی میں معرفت الٰہی کا راگ الاپ رہی تھی۔

میں نے سونے کی کوشش کرتے ہوئے ایک کتاب اُٹھائی اور مسعود جاوید کا افسانہ "کیوپڈ کی آنکھیں" پڑھنے لگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسانی فطرت کی نام نہاد وسعتوں کو بے حجاب دیکھنے کا بہترین وقت وہ ہے جب اس کی کوئی محبوب ترین تمنا غیر متوقع دشواریوں سے متصادم ہو کر جان دے رہی ہو۔

یہ پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آگئی اور میں کتاب میز پر رکھنے لگی تو شمیم کا خط دیکھا جو آج کی ڈاک سے آیا تھا۔ میں نے غیر ارادی قوت سے اُٹھایا اور پڑھنے لگی۔

اس کی تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ صبح سب سے پہلے اُسے جواب دونگی۔ اور ہر ممکن مدد کروں گی اور اُسے یہ ثبوت دوں گی۔ کہ میری آغوشِ محبت بدستور تمہارے لئے وا ہے۔ مگر اُس کم نصیب کے مقدر کی ہار میرے اس عزم میں حائل ہو کر رہ گئی!!!

وہ اپنا پتہ خط میں لکھنا بھول گئی تھی!!

میں یہ سوچ کر سو گئی۔ کہ صبح کسی ذریعہ سے اُس کا پتہ دریافت کر کے خط لکھوں گی۔ لیکن کسی کے بگڑے ہوئے مقدّر کو سلجھانا مشیّت ایزدی نے اپنے قبضۂ اختیار میں رکھا ہے۔ کسی انسان کی کیا مجال کہ وہ اس کی مخلوق کو بغیر اُس کی رضامندی کے کوئی نقصان یا فائدہ پہنچا سکے۔

شمع ایک ایسی عورت تھی جس کا چہرہ بکھرے ہوئے بالوں میں ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صبح و شام ہم آغوش ہو رہے ہوں۔ اس کا متناسب جسم جیسے یاسمین کے پھولوں کا گلدستہ جو ابھی نیا رکیا گیا ہو۔

میں سوچ رہی تھی کہ لطافت کے اس پیکر کو اُس کی بلند اور رنگین آرزوؤں کو فرسودہ رسوم کی خاطر کیوں دفن کر دیا گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر ممکن طریقے سے اُس کا پتہ دریافت کر کے اپنی ہمدردی و محبت سے اُس کی زندگی کو روشن کروں گی۔

جب میں صبح بیدار ہوئی تو سوائے دیر سے سونے کی کسل مندی کے مجھ کو اور کوئی تکان محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اُٹھی لباس تبدیل کیا اور فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مصروف ہو گئی۔

کتاب مقدّس کے مطالعہ کے بعد میں نے بلورین شمعدان کو گل کیا۔ روشن شمع کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے شمع کا منظر آیا۔ جس پر اب یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ میرا سر چکرا گیا۔

اتنے میں نیلوفر چاندی کے فنجان میں صبح کا قہوہ لے کر آئی۔ قہوہ نوش کرنے کے بعد میرے بے ترتیب خیالات میں تسلسل پیدا ہو گیا۔

اور نیلوفر نے مجھے اپنا پروگرام یاد کرایا۔

اس دن اصلاح دیہات کے متعلق ایک جلسہ میں مجھے صدارت کرنی تھی۔ ہر روز میرا تمام وقت جلسوں میں شرکت کرنے یا گھر آنے والے مہمانوں سے ملنے جلنے میں صرف ہو جاتا میں بڑی بڑی رقوم چندوں میں دیتی اور جلسوں کی صدارت کر کے تحسین و آفرین کی گونج میں تالیوں کے شور سے اپنی شخصیت پر ایک ملکوتی شان طاری کئے سٹیج سے اُترتی۔

علی الصبح روزانہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی اور رات تک اُس کا سلسلہ جاری رہتا میری سیکرٹری کو میری کارفرمائیوں اور قومی تحریکوں میں شرکت کے مختلف اوقات مقرر کرتے ہوئے کسی اور کام کا موقعہ نہ ملتا۔

ہر روز صبح و شام کچھ انہیں مشاغل میں گزر جاتے۔ پولیٹکل اور سوشل مسئلوں کو حل کرنے سے فرصت نہ ملتی کہ میں ایک دکھیا کی پکار سن کر اس کی ناکام آرزوؤں کو پورا کر سکتی۔ میرے سر میں درد تھا۔ اور میں بہت جلدی اپنی خواب گاہ میں آگئی دن بھر کی مصروفیت ریاضت، عبادت نے مجھے تھکا دیا تھا۔

میری خواب گاہ گلستان ارم بنی تھی۔ یہاں آکر مجھے کافی سکون نصیب ہوا۔ مگر چند لمحوں بعد شمع کی زندگی کے چند نمایاں پہلو میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں سوچنے لگی۔ شمع کی زندگی

جس کا ایک جبری زندگی سے موسوم کروں تو شاید کفر بھی نہ ہو کیسی زندگی ہے ؟

قدرت کی طرف سے ہر انسان کو زندگی عطا ہوئی ہے اور مقررہ میعاد تک ہر ایک اس دنیا میں رہتا ہے۔ اس عالمِ رنگ و بو کی بہار بھی ہر ایک کو دیکھنی ہے اور خزاں بھی۔ لیکن شمع کی زندگی بہار تھی کب ؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور خیالات کی دنیا میں کھو گئی !!

ایک انسان کو اس دنیا میں قدم رکھتے ہی غربت، مفلسی کا پیراہن ملتا ہے اور دوسرے کو قبائے زرین ـــــ پیدا کرنے والا، زندگی بخشنے والا تو ایک ہی قادرِ مطلق ہے !

غریب کا خدا بھی وہی ہے اور امیر کا خالق بھی وہی۔ لیکن پھر یہ امتیاز کیسا ؟ میں فلسفہ حیات کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی ـــ !!

میرے نزدیک بربطِ زندگی کے تاروں سے مسرت و شادمانی کے نغمے ہی نہیں بلند ہوتے بلکہ ایسے نغمے بھی ہوتے ہیں جن میں غم اندوہ، یاس، ناکامی، لاچاری کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ جب میرا دماغ بہت تھک گیا۔ تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ان ناخوشگوار تاثرات سے نجات پانے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ اسی وقت کوثر و تسنیم سبز زرتار پردہ ہٹا کر اندر آگئیں اور فکر مندانہ لہجہ میں خواب گاہ سے باہر آنے کا سبب پوچھنے لگیں۔

میں بادل نخواستہ اُٹھی نیلوفر کی مدد سے قوس و قزح کے رنگوں سے مشابہت رکھنے والا لباس پہنا اور شمع کا خط بیگ میں رکھ کر باہر آگئی! مجھے ایک جلسہ میں صدارت کرنی تھی۔ کار میں بیٹھ کر اپنی تقدیر سوچنے لگی۔ جب جلسہ گاہ میں پہنچی تو سب نے میرا پرجوش خیر مقدم کیا اور لاتعداد پھولوں کے ہار پہنا کر سٹیج پر پہنچایا۔ میں اپنی خوش بیانی اور لسانی پہ نازاں نہایت زوردار پر مغز خطبہ صدارت پڑھنے لگی۔ گاؤں والوں کی مصیبت زدہ زندگی دیہاتی غیر منظم اصول کے ماتحت اُن کی تباہیاں، سرمایہ کی کمی کے باعث فصل و زمین کی بربادی زمینداروں کا کسانوں سے عدم تعاون اور بے پرواہی میں نے ایسے اثر پذیر انداز میں بیان کیا کہ سب لوگ متأثر ہو گئے۔ میں نے امداد میں اقدام کرتے ہوئے پانچ ہزار روپیہ اس تجویز کی تکمیل کے لئے پیش کیا۔ تو پھر سب شریک جلسہ معززین نے میری تقلید کی اِس کے بعد تالیوں کی گونج اور تحسین و آفرین کے نعروں کے ساتھ جلسہ برخاست ہو گیا۔ اور میں "ایوانِ رفعت" میں واپس آگئی۔

میں جلسہ کی کامیابی کی مسرتوں سے مالا مال تھی تعریفی کلمات میرے دل و دماغ پر نشہ مسرت بن کر چھا رہے تھے۔ اور میں شمع کی زندگی کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ کار سے اُتر کر جب میں سانپ کی وضع کی بل کھاتی سیڑھیاں طے کر کے ہال میں پہنچی تو امی کا چہرہ شفقت کے نور سے چمکتا نظر آیا میں آگے

بڑھ کر جھکی اور آداب بجا لائی۔

ابّی نے اپنا دستِ شفقت میرے کاندھے پر رکھا اور میری عملی سرگرمیوں کی داد دی۔ اور محبت سے اپنے پاس بٹھا کر اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔ اتنے میں صنوبر نے کھانا میز پر لگ جانے کی اطلاع دی۔ مجھے بھوک نہ تھی سر میں درد تھا کھانا نہ کھانے کی ابّی سے معذرت چاہی اور خواب گاہ کی طرف جانے لگی! ابی نے میرے چہرہ کو نگاہِ محبت سے دیکھ کر امی سے کہا۔ کاش! فوزیہ میرا بیٹا ہوتا

امی نے طنزیہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ بیٹی ہو کر فوزیہ کس شعبہ میں کم نکلی؟ اگر حقیقت سے دیکھا جائے تو بیٹیاں عمر کے ہر حصہ میں آخری دم تک والدین کی اطاعت گزار رہتی ہیں!

اور بیٹے؟ ابّی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنی منظورِ نظر کو پاکر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہو کی اجازت بغیر بیٹے کا ملنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ امی نے جواب دیا۔ اور پھر اس بات پر دونوں ہنسنے لگے اور میں خواب گاہ میں آکر لیٹ گئی۔

رات کو سخت بے چینی کا عالم طاری رہا۔ صبح اُٹھی تو بخار تھا۔ عبادت سے فارغ ہو کر جب میں قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو مجھے اپنا چہرہ بہت کمزور نظر آیا۔ میں نے اُس صبح

زرد لباس پہن رکھا تھا جس نے مجھے اور زیادہ مضمحل کر دیا۔ اُس صبح نیلوفر نے میرے بالوں میں نرگس کے پھول سجائے تھے اور میں بخارچہ کے زردی مائل شیشوں کے سامنے آفتاب کی سنہری شعاعوں میں لپیٹ باہر کی طرف دیکھ رہی تھی اور دنیا مجھے خواب و افسانوں کی سرزمین معلوم ہو رہی تھی۔

سفید ریشمی لبادے میں ملبوس ابی میری خواب گاہ میں آئے۔ اور کہا۔

فوزیہ نیلوفر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہاری طبیعت آج مضمحل ہے پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے تم تو واقعی نرگس بیمار معلوم ہو رہی ہو۔

میں تعظیماً کھڑی ہو گئی۔ امی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما اور فکرمندانہ لہجہ میں کہا اس کو اس وقت بھی بخار ہے۔

اسے اچانک بخار کیوں ہو گیا؟ میرے خیال میں آج ہی اس کو کوہ یاسمیں لے چلیں۔ وہاں کے صحت بخش، حیات افروز فضاؤں میں اسے کافی آرام ملے گا۔ یہاں اگر یہ ایسی ہی علمی عملی سرگرمیوں میں مصروف رہی تو صحت بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ ابی نے پریشان ہو کر کہا۔

امی نے شفقت سے معمور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ کر کہا واقعی اس کو اس ماحول سے جلدی ہٹانا چاہیئے۔

تسنیم، کوثر، نیلوفر کو میں نے بُلایا۔ اور ان کو سفر کے متعلق

ہدایتیں دے کر سامان باندھنے کو کہا اور پھر ابی کے ساتھ اطالوی صوفہ پر بیٹھ کر باہر کی فضا کو دیکھنے لگی۔

کوہِ یاسمیں کدھر ہے ابی ؟ میں نے پوچھا۔

اخبار پڑھتے ہوئے ابی نے جواب دیا۔لیکن میں نہ سمجھ سکی !!!

میرے دل میں شمع کی یاد کی شمع آج پھر روشن ہوگئی اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار کوہ یاسمیں کے دیدہ افروز پہاڑوں، بل کھاتی گھاٹیوں، اور شیریں چشموں کا ذکر شمع نے مجھ سے کیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ یہ پہاڑ میرے گاؤں سے بہت قریب ہے۔اور کوہِ یاسمیں کی ایک بلند چوٹی پر سینی ٹوریم بھی بن رہا ہے !!

کوہ یاسمیں آکر یہیں چین، سکون اور خاموشی کے ساتھ دن گزار رہی تھی۔ یہاں ایک بہت بڑا پیلس "لالہ زار" کے نام سے سرکاری طور امرا و رؤسا کے ٹھہرنے کو بنا ہوا تھا۔جس کے آگے باغات تھے اور ان میں جا بجا بارہ دریاں تھیں۔ سارے پیلس میں شفاف نہریں تھیں اور اُن میں فوارے لگے تھے۔

"لالہ زار" ایک وسیع اور بلند عمارت تھی۔ تمام کواڑ آبنوس کے تھے جن پر ہاتھی دانت کا نہایت باریک کام تھا۔اس پیلس کے ایک کمرے میں سنگ سماق کا ایک بڑا حوض تھا جس میں پارہ بھر دیا گیا تھا۔اُس پر جب سورج کی کرنیں پڑتیں تو اُن میں اتنی چمک پیدا ہوتی کہ آنکھیں چندھیا جاتیں۔پارے کو اگر ذرا ہلا دیا جاتا

تو ایسا معلوم ہوتا کہ پیلس میں زلزلہ آگیا ہے۔

میں اس فردوس نما مقام پر آکر تمام دنیاوی اُلجھنوں سے بے نیاز کسی ایسی جگہ جانے کی آرزومند تھی۔ جہاں کی سرزمین سے سُورج کبھی غروب نہ ہو۔ دُور بہت دُور ستاروں سے آگے جہاں سرسبز باغات ہیں گھنے گھنے جنگل، اونچے نیچے پہاڑ، بہتے ہوئے آبشار، اُبلتے ہوئے چشمے، سرد اور میٹھے تالاب۔ تالابوں میں سنہری مچھلیاں اور باغوں میں حسین پرندے ہوں جن کے سریلے نغموں میں زندگی کا وہ راگ پا سکوں، جس سے زندگی وآخرت دونوں سنور سکیں۔ اور پھر دُور ستاروں سے بھی آگے چلی جاؤں جہاں سماج کے ہاتھوں ستائے ہوئے مظلوم پناہ لیتے ہیں۔ اور وہاں اُن کے لئے کوئی سماج نہیں۔ وہ بجائے دبی ہوئی آہوں اور جھوٹی مسکراہٹوں کے آزاد و بلند قہقہے لگا سکتے ہیں۔ میں بھی اپنی پاکیزہ تمناؤں کو سینہ سے لگائے اُن کے پاس جاکر اُنہیں پر خلوص زندگی منزہ محبت کی تلقین کر کے خاموش ہو جاؤں تاکہ وہاں کے بسنے والے میری پُر رشک زندگی اور موت پر آنسو بہاتے کنول کے پھولوں میں چھپا دیں!!

آج مجھے ریاست "گل افشاں" میں واپس جانا تھا کوہ یاسمین کے قیام میں کئی زمینداروں کی جاہل مستورات سے میں مل چکی تھی۔ وہاں کی خواتین پابندی کی بیڑیاں پہن کر قید و بند میں مقید ہیں کوہ یاسمین ایک حسین ترین وادی ہے جو یاسمین کی کلیوں سے

ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کے گرد و نواح میں بہت سے گاؤں آباد ہیں جن کے مختلف نام ہیں۔

کوہ یاسمیں کے قیام میں سنا کہ پہاڑ کی بلند چوٹی پر سینی ٹوریم ہے جسمیں بعض زندہ لاشیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ وہاں مریضوں کے لئے ایک بہت بڑی لائبریری بھی ہے۔ جس کے انچارج "کرنل زیدی" ہیں جو کافی عرصہ پیرس میں رہنے کے بعد اپنے پیشہ سے اُکتا کر کوہ یاسمیں میں آ گئے۔ پہلے تو وہ گوشہ نشین رہے۔ مگر پھر سسکتی، کراہتی زندگیوں کا احساس کر گئے جن میں کئی دھڑکتے دل زندگی کی حسین پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے مجروح ہو کر ٹی بی کا شکار ہو کر عالمِ نزع میں زندہ تھے۔ اُن کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

"کرنل زیدی" ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے وہ نہ صرف ڈاکٹر تھے بلکہ بلکتی سسکتی زندگیوں کی دردمندیوں کا احساس کر کے تڑپ جانے والا ایک شاعر بھی!!

مجھے پھر بخار ہو گیا اور سر میں سخت درد تھا۔ "کرنل زیدی" میرا علاج کر رہے تھے ایک شام کرنل زیدی بہت دیر سے آئے اُس کے متبسم ہونٹوں پر ایک افسردگی مسلط تھی۔ میرے کمرے میں گہرا سکوت تھا صرف کلاک جو شاہین نما پر پھیلائے آویزاں تھا اُس کی حرکت کی آواز آ رہی تھی یا حسین پھولوں پر تیرنے والی رنگین تتلیوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی۔

ڈاکٹر کو دیکھ کر ابی نے کہا دیکھئے کرنل زیدی! صاحبزادی فوزیہ کس قدر کمزور ہو گئی ہیں۔ مجھے تشویش ہے اس کی صحت زیادہ بگڑ نہ جائے۔ کرنل آپ نہیں جانتے کہ فوزیہ کی زندگی میرے لئے کتنی نایاب ہے۔

جی ہاں! زیدی نے کہا میں خوب جانتا ہوں بعض زندگیاں نایاب ہوتے بھی ارزاں ہیں اور کوئی ارزاں ہوتے ہوئے بھی نایاب۔ کرنل زیدی نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر اُس کے لبوں سے وہ مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔ میرے پاس رکھے ہوئے سانپ کی وضع کے بلوریں شمعدان کو دیکھ کر کہنے لگا۔ اس افعی نے شمع کو نگل لیا؟

میں نے تکیہ سے جس پر یاسمین کی کلیوں کا غلاف لپٹا ہوا تھا اپنا سر اُٹھایا اور نیلوفر نے چاندی کے پیمانہ میں دوا ڈال کر میرے منہ سے لگا دی۔ کرنل زیدی میری طرف دیکھ کر ایک طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگے!

صاحبزادی فوزیہ آپ جلد اچھی ہو جائیں۔ بیماری آپ کے شان کے خلاف ہے۔

ڈاکٹر آج مجھے بہت پسینہ آیا۔ ابی نے یہ مبارک علامت جان کر غربا میں کھانا تقسیم کرایا۔ اور کئی دیگیں سینی ٹوریم کے مریضوں کے لئے بھجوائیں اور آپ دعوت میں باوجود مدعو کرنے کے نہ آئے!

کرنل زیدی کھڑے ہو گئے اور مغربی سمت کے بیضوی دریچہ

سے باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ صاحبزادی صاحبہ جو سوز بھری زندگی ہوت کی تاریکیوں میں آج روپوشس ہو رہی ہے اُس سے منہ موڑ کر دعوت میں شریک ہو کر لطفِ زندگی حاصل نہیں کر سکتا۔ اُف! خدا کی اس وسیع دنیا میں اس کی اتنی بڑی صاحب استطاعت مخلوق سے کسی ایک کو یہ جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ آلام میں لپٹی خودداری کی چکی میں پس جانے والی ناشاد روح کو تسکین دے کر اُس درخت کے سائے میں جانے سے روک لے۔ جس کے پتے فنا کا راگ گا رہے ہیں۔

تسنیم و کوثر کمرہ میں آئیں۔ کوثر نے مجھے سہارا دیا اور تسنیم نے سنہری ورق میں لپٹی ہوئی مقوی دوا کھلائی۔

کرنل زیدی نے گفتگو کا تسلسل قطع نہ کرتے ہوئے کہا۔ ارمانوں کی چتا پر زندہ جلتی ہوئی لاشوں کو اپنی توجہ سے، احساسات کے درجے کو بلند کر کے ٹھنڈا کیا جائے۔ بے پروائی و بے نیازی کے گرداب سے نکل کر کراہتی ہچکیاں لیتی زندگیوں کے گرد آلود خاکستر دامن تھامے جائیں، تب انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ میں نے کہا ایسے انسان دیکھے ہیں جو نصیحت کرنا جانتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ نصیحت کرنے سے عمل کرنا بہتر ہے۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ کرنل زیدی آپ نے آج کیا گفتگو شروع کی؟ رسالہ شعلہ کے خاص نمبر کی ترتیب کی مصروفیت میں خود بھی شعلہ بن گئے؟

زیدی نے کہا جی ہاں! شعلہ کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر شمع کی طرح جلنا بہت مشکل ہے!

شمع کی طرح جلنا! شمع جلتی ہے؟ میں سوچتے سوچتے گہرائیوں میں ڈوب گئی اور دور خلا میں گھورنے لگی۔

کرنل زیدی انتہائی درد میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھا اور مجھے ایک یاقوت کی طرح دہکتی ہوئی جلد والی کاپی دی۔ جس کے سرورق پہ لکھا تھا۔

"شمع کے آنسو"

کرنل زیدی نے اس عنوان پہ اُنگلی رکھی اور کہا صاحبزادی فوزیہ یہ ایک گلشن عالم کا پھول تھا۔ جسے بادِ سموم کے جھونکوں نے وقت سے پہلے مرجھا دیا۔ یہ ریاض جمال کا شگفتہ پھول، یہ تنویر حسن کی رنگین شعاع جو آج فنا کے اندھیرے میں چھپ جائے گی۔ ہمیشہ کے لئے قیامت تک کے لئے!!

صاحبزادی فوزیہ مجھے اس کی خستہ حال زندگی نے بُری طرح مجروح کر دیا ہے۔ آہ! میں اس ستم رسیدہ کے لئے اس کی زندگی میں کوئی بہتری، کوئی ہمدردی عملی طور نہ کر سکا۔ میں نے اپنی دماغی قوت سے وہ علاج فراہم کئے جنہوں نے اُسے جانکنی کے عالم میں عرصہ دراز تک زندہ رہنے کے لئے مجبور کئے رکھا۔ میں نے اُس کا جو علاج کیا وہ انسانی ہمدردی کے تقاضا پر نہیں اُس کی گرانقدر شخصیت

کی قدر افزائی کے لیے نہیں بلکہ اپنے تجربوں کو وسعت دینے کے لئے اپنے ریکارڈ کو اُجاگر کرنے کی خاطر کہ میرے حیات افروز علاج نے ایک ایسی زندگی کو جس کے دروازہ پر موت کھڑی دستک دے رہی تھی۔ مدتوں عالم سکرات میں زندہ رکھا۔ مگر آج میرے تجربہ کی ہار ہے اور موت کی فتح ——— !! جب میں نے دیکھا کہ زندگی کی حرارت پر موت کی خنکی لحہ بہ لمحہ اثر پذیر ہے تو میں نے اس کے وارثوں کو اطلاع بھجوادی اس کا سب بکھرا ہوا سامان اپنی نگرانی میں بندھوایا لیکن یہ کاپی ہسپتال کے کاغذات کے ساتھ میرے میز پر آ گئی۔ جس کو پڑھ کر پھر میں اُس کمرہ میں نہ جا سکا۔ جہاں ایک مظلوم اس مکر و فریب کی دنیا سے کنارہ کش ہو کر ملک عدم کی طرف آمادہ سفر ہے دل کی مجروح حالت کو بدلنے کے لئے آپ کی طرف آیا لیکن یہاں آکر ایک نواب زادی کے شاہانہ استغراق نے حیران کر دیا آپ کے دردِ سر سے جو افسردگی میں نے اس کمرہ کی دیواروں اطالوی صوفوں۔ ایرانی قالینوں، خوشن وضع دریچوں۔ سرسراتے ہوئے یاسمیں کے پردوں پر اور ان کے آگے بابل جیسے لہلہاتے آویزاں باغوں پر دیکھی وہ میں نے جانکنی کا عالم طاری ہونے والی پر ارمان، تختہ ستم ناشاد روح کے قریبی رشتہ داروں، اور عزیزوں کے پر فریب چہروں پر نہیں دیکھی میں جا رہا ہوں۔ صاحبزادی فوزیہ مجھے ڈر ہے کہ یہ میرے بڑھتے ہوئے احساسات مجھے پاگل نہ کر دیں۔ یہ کہہ کر کرنل زیدی دور بہت دور سبزہ زاروں سے پرے اونچے نیچے سیاہی مائل سبز بوڑھے درختوں کے

پار مغربی جھیل کے کنارے یاسمین کے گھنے کنج میں غائب ہو گئے۔
زندگی مجھے ایک بھیانک افسردہ درد انگیز خواب معلوم ہونے لگی۔ میں سوچنے لگی معبود جانے اس خواب کی تعبیر کس قدر خوفناک ہو گی میری روح سہم رہی تھی۔ یاقوتی رنگ کی کاپی ایرانی قالین پر بکھری ہوئی تھی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اُٹھائی اور سبز قمقمہ کی روشنی میں پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

ادبی فضا اور دنیائے ادب و علم سے مجھے بہت دلچسپی ہے لیکن میں حسب دلخواہ تعلیم نہ پا سکی۔ افسوس میری زرنگار آرزو شرمندہ تکمیل نہ ہوئی۔

صاحبزادی فوزیہ کو مجھ سے قلبی لگاؤ تھا وہ اکثر مجھ سے ستار پر اپنے پسندیدہ اشعار اور عمر خیام کی رباعیاں سنا کرتی تھیں صاحبزادی فوزیہ کا خیال تھا۔ کہ میری آواز میں ایک سوز نما ترنم موجود ہے جس کی نزاکت انہیں بہت مرغوب ہے۔

میں تمام وقت "ایوانِ رفعت" میں صاحبزادی فوزیہ کی رفاقت میں گزارنا چاہتی تھی لیکن ایسا نہ کر سکی۔ میرا باپ آغا سلیم پرانی روایتوں سے ملوث ایک غیور پٹھان ہے۔ تعلیم اناث کے وہ بے حد خلاف ہے
صاحبزادی فوزیہ جب اپنے ملک کے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد دوسرے ممالک میں بھیج رہی تھی اور پھر اُنہوں نے مختلف

طبقوں کو فائدہ سے پہنچائیے تو میرا دل بھی دھڑکا۔ کہ کاش! ان نوازشات عظیم کی میں بھی حصہ دار بنوں. مگر صاحبزادی فوزیہ نے ایسا نہ کیا۔

میں اپنی پابند و مقید زندگی کا بہت کم وقت "ایوان رفعت" اور "قصر منیر" میں گزار سکی۔ کیونکہ "خان آغا" نوجوان لڑکیوں کا اپنے گھر سے باہر جانا معیوب خیال کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ہر لڑکی کی عفت عصمت کی پاسداری جتنی گھر کی چار دیواری کر سکتی ہے اتنی فطری شرم و حیا اور وہ شرافت جو ہر شریف دوشیزہ کا طرۂ امتیاز ہے نہیں کر سکتی۔

آغاجی کے ان دقیانوسی خیالات سے صاحبزادی فوزیہ اور اعلیٰ حضرت بخوبی واقف ہیں۔ جبھی تو کسی نے ان کے خیالات سے اُلجھنا پسند نہیں کیا اور آغاجی کو اپنے حال پر چھوڑ کر مجھے عزبت کی چکی میں پس جانے دیا۔ میں صاحبزادی فوزیہ سے گلہ نہیں کرتی۔ دنیا اسی چیز کا نام ہے کہ اپنی "کشمکش حیات" میں کسی دوسرے کی فکر اور تشویش کو شامل نہ کیا جائے۔

اگر ممکن ہوتا، تو میں ان چلتے، پھرتے، ہنستے، بولتے انسانوں کے سینے چیر کر دیکھتی کہ ان میں کتنے کلیجے ایسے ہیں جن میں کوئی پھانس نہیں چُبھی ہوئی۔ وہ کونسا دل ہے جس میں کوئی خراش نہیں آئی!

میرا تو یہ ایمان ہے کہ جس طرح ہر انسان اپنی زندگی جیتا ہے اور اپنی موت مرتا ہے اسی طرح ہر انسان کو اپنا غم خود ہی کھانا ہے اپنے آلام میں دوسروں سے ہمدردی کی توقع رکھنا ایک لطیف ترین فریب ہے آہ سے

کچھ حسیں دھوکے ہیں جن کے واسطے جینا پڑا
زندگی شاید فریبِ زندگی کا نام ہے

میرے نزدیک کارزارِ حیات کو طے کرنے کے لیئے اپنی ہمت ہی ایسی چیز ہے۔ جو عطیہ خداوندی ہے اُس وقت جب ذرہ ذرہ اپنے درپئے آزار نظر آتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز سانپ دکھائی دیتی ہے۔ خود اعتباری تو درکنار اپنا سایہ تک گریزاں نظر آتا ہے۔ اور روح آمادہ بہ تخریب!!
تو پھر ہمت ہی ایک ایسی چیز ہوتی ہے۔ جو سرگوشی کے لہجے میں ڈھارس بندھاتی ہے اور ثابت قدمی سے راہِ حیات استوار کرتی جاتی ہے۔ اور ایسے اسباق دلیری و جرأت دیتی ہے جو روح کو زندہ رکھتے ہوئے قلب کو شگفتہ کر کے قدم قدم پہ دامن تھامتے ہوئے کانٹوں کو علیحدہ کرتی ہے اور رموزِ حیات سے روشناس کراتی ہے اپنے لمس ساحرانہ سے رگ و پے کو تابندہ سیماب دار پرجوش کر کے حال سے منہ موڑ لینے کے بجائے مستقبل تک کی خواہش پیدا کرتی ہے اور حوادث وقت سے مردانہ وار جنگ کرنے کا شوق دلاتی ہے تاکہ وقتی تاریکیوں میں صبح اُمید طلوع کر سکے۔

میرے ضمیر کی یہ آواز تھی جس نے مدتوں مجھے حالات، واقعات حادثات اور تاریک خیالات سے مقاومت کرنے کے لئے سرگرم عمل رکھا۔

اب میں ریاست "گل افشاں" چھوڑ کر صاحبزادی فوزیہ کی رفاقت

سے الگ ہو کر وہاں کی علمی، ادبی مجلسوں سے دور رہ کر یہاں سخت اداس ہوں اس ماحول میں آکر بھی میں اپنی پرانی بزم آرائیاں نہیں بھولی۔ یہاں کی پست خیالیاں میرے "بلند پرواز تخیل" کے حسین قصر کو متزلزل نہیں کر سکیں میرا دل انہیں میں کھویا ہوا ہے۔

کتاب ماضی کی ورق گردانی سے دل میں شیریں درد۔ میٹھی خلش پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش! وہ دن پھر لوٹ آئیں اور میں اُنہیں ادبی فضاؤں میں کھو جاؤں۔

وہ ادبی، علمی بحثیں، وہ فوزیہ کی قربت میں ستار پر شیریں نغمے وہ عمر خیام کی شوخ رباعیاں، پھر تھرتھرانے لگیں، وہ فوزیہ کی معصوم شوخیاں اور اُس کی محبت کی منزہ کرشمہ سازیاں میرے دل میں جگمگانے کے بجائے آنکھوں کے سامنے حقیقت کی دنیا میں آکر چمکیں۔!!

یہاں کی جاہل مخلوق، بدوضع لباس، غلیظ جسم، بعض اوقات کس بے رحمی سے میرے افکار میں داخل ہوتے ہیں۔ اُن کی بے ہنگم چیخیں مخصوص فقرے بے ربط پکاریں میری افسردگیوں کو ایک ہنگامہ کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

میں یہاں سوسائٹی کو ترس گئی۔ دن نہایت بے کیفی سے بسر ہو رہے ہیں۔ ادب سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور ایک ایسا والہانہ انس جو تا زیست میری روح کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ زمانہ کی گردش سماج کی سفاکیاں مجھ سے میری یہ متاعِ عزیز چھین لینے میں

کامیاب نہایں ہوئیں۔

ریاست "گل افشاں" میں میں نے زندگی کے اُس بے فکر و پُرمسرت زمانہ میں کئی افسانے لکھے تھے۔ اور کئی تنقیدی مضمون بھی۔ غرض اپنی جنس کی خدمت میں کافی حصہ لیا۔ لیکن مقدر کو بنانا میرے اپنے اختیار میں نہ تھا۔

ایک مشرقی حیاپرور دختر اسلام کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے والدین کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔!!

دنیا کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان اور برادری کا تکبر انسانی نسل کے باہم منافرت کا سبب ہے اور یہی ان قوموں کی تباہی کا باعث ہے۔

بعض طبقوں میں خاندان کے غرور نے جنس لطیف کو نقصان پہنچایا ہے۔ فی زمانہ جس قدر اقوام ترقی یافتہ نظر آتی ہیں تو وہ اس وقت کامیاب ہوئیں جب انہوں نے اپنے دلوں سے خاندانی غرور و تکبر کو نکال دیا۔

روس، ٹرکی، جاپان نے دنیا کی نامور قوموں میں اپنا شمار اس وقت کرایا۔ جب ان خرافات کی اپنے وطن سے بیخ کنی کر دی۔ ظہور اسلام سے قبل نسلی امتیاز جنگ و جدل کا باعث بنا ہُوا تھا۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی عداوت تمام عرب کے لئے باعث ذلت تھی۔ اور تمام ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر قرآن پاک نے نسلی امتیاز کو مٹا دیا۔ رسول مقبول نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سے فرمایا تھا۔ کہ ؎

بندگی باید پیمبر زادگی درکار نیست

اس بدعت کو توڑنے کے لئے نبی کریم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کا نکاح ایک غیر کفو نام نہاد غلام حضرت زید کے ساتھ کیا تھا اور اس طرح یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔ کہ خاندان یا برادری شرافت اور ذلت کا معیار نہیں بلکہ اچھے اور برے اعمال ہیں۔ پھر قرآن پاک نے نسلی امتیاز کو اس طرح مٹایا۔

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقکم۔

ترجمہ:۔ اور کیا ہم نے تم کو کنبے اور قبیلے تاکہ ایکدوسرے کو پہچانو۔ بتحقیق بزرگ وہ ہے جو متقی یعنی خدا سے ڈرنے والا ہے۔

زندگی کا یہ تضاد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ بڑے بڑے عالیشان محلوں میں رہنے والے امیر اور ادھر ننگے جسموں پر چلچلاتی دھوپ کو ٹھنڈی چاندنی کی مانند سہنے والے غریب۔ اُف! خدا!! زندگی کے یہ اونچ نیچ زندگی کے بہتے ہوئے لامحدود سمندر کے دو ساحل لیکن متضاد۔ دونوں کے درمیان ایک خلیج ہے ناقابل عبور اور دونوں نشیب و فراز کا ایک غمناک مرقع ہیں بعض اوقات بے طرح اداس ہو کر ندیم کا یہ شعر پڑھتی ہوں

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں یہ نشیب و فراز
یارب میری نظروں میں دو عالم کو برابر کر دے

ریاست "گل افشاں" کے رنگین لمحات کو میں زندگی کی تنہائیوں

میں یاد کرتی ہوں کہ جب میں ایک آزاد طائر کی طرح وہاں کی ادبی فضاؤں میں چنچل اور سرد ہواؤں میں صیاد کی نگاہوں سے محفوظ پرواز کرتی تھی مگر طائر وقت کی تیز پرواز نے میری آزادی کو ایک قفس میں بند کر دیا۔ اور مجھ سے وہ بے فکری اور شادمانی چھین لی۔!!

یہاں اب میری فضا پرواز تخیل کے لئے تنگ اور ناموزون ہے میرا عقد اپنے خاندان کے ایک نیم خواندہ موٹر ڈرائیور سے کر دیا۔ اور میرے تصورات کے بلند قصر پاش پاش ہو گئے۔ شمع امید ناکامیوں کی ظلمات میں ٹمٹمانے لگی اور میں نے اپنی تمناؤں کی چتا کو جلتے دیکھ کر پوری قوت سے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگی کہ قدرت کے اس کھیل کا انجام کیا ہوگا؟

مغربی پہاڑوں کی ان بلند چوٹیوں کو میں دیکھتی جن کے عقب سے کوئی راستہ ریاست "گل افشاں" میں صاحبزادی فوزیہ کے ایوان رفعت میں جاتا ہے۔ مجھے صاحبزادی فوزیہ کیوں اس قدر یاد آ رہی ہیں جبکہ اُس نے میرے خط کا جواب ہی نہیں دیا؟ کیا اس لئے کہ اُس کا ستارہ حیات عرش کی رفعتوں سے ٹکراتا ہے اور میں فرش کی پستیوں میں چکنا چور ہوں؟ کسی وقت دل چاہتا ہے کہ سماج کے ان بے بنیاد قانون کو ایسی ٹھوکر لگاؤں کہ پھر یہ دیواریں صنفِ نازک کے درمیان حائل نہ ہوں۔ مگر میری فطری حیا یہ جرأت نہیں دیتی کہ سماج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں شائد اسی کمزوری کی بدولت سماج کی یہ بنائی ہوئی دیواریں میری شاہراہ زندگی میں

سنگین تر ہوتی گئیں۔

مجھے وہ دن بخوبی یاد ہے۔ جب کمرہ کے وسط میں میری آرزوؤں کا مدفن بن رہا تھا۔ سماج کے قانون دان اپنے ہاتھوں میری امیدوں کی چتا تیار کر رہے تھے آگ کے شعلے میرے عروسی لباس کی طرح زرد تھے اور میں ان شعلوں کی لپٹوں میں "دلہن" بنی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو سیل رواں کی طرح جاری تھے مگر یہ پانی اس چتا کو نہ بجھا سکا جس کے شعلوں میں جل رہی تھی۔

میری بہت سی رشتہ دار خواتین مجھے رخصت کرنے آئی تھیں اور میں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے بچا لے اس عذابِ عظیم سے۔ کوئی بجھا دے اس بھڑکتی ہوئی آتش کو، کوئی سرد کر دے اس دہکتی چتا کو۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

میں اس گھر سے رخصت ہوئی جہاں میں نے زندگی کے روشن دن گزارے تھے۔ میں اپنے والدین سے جدا ہوئی جو دنیا میں میرے لئے سب سے بڑی نعمت ہیں۔ کہاروں نے ایک طویل راستہ طے کر کے مجھے میری "منزل" پر پہنچایا۔ وہاں جو عورتیں میرے استقبال کو موجود تھیں اُن کے لباس کی تعفن نے مجھے بتایا کہ یہ مخلوق گائے، بھینسوں، بکریوں کے ریوڑوں میں رہنا جانتی ہیں۔ وہ مجھے اس انداز سے دیکھ رہی تھیں۔ گویا میں کوئی عجیب ہستی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میری خوشدامن اور ان کی ہم پلہ خواتین نے میرے جہیز پر طنزیہ فقرے کسنا شروع کئے اُس

وقت مجھے میرا تخیل ایک اور عالم میں لے گیا۔

میں نے تصور میں دیکھا کہ میں ریاست "گل افشاں" میں صاحبزادی فوزیہ کی شاعرانہ نکتہ نوازیوں سے محظوظ ہو رہی ہوں۔ ادبی ذوق کی دلدادہ خواتین کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوں اور ان کی مہذبانہ، شاعرانہ گفتگو میری سامعہ نوازی کر رہی ہے۔

میری شادی کو چھ ماہ گذر گئے ہیں۔ اپنی خوشدامن اور سب کی طعنہ زنی ہر طرح کی روک ٹوک کو برداشت کر کے زندگی گزارنے کی کوشش میں لگی رہی۔ ہرچند قلب و جگر چھلنی ہوئے جاتے تھے مگر میں صبر و ضبط کا دامن مضبوطی سے تھامے رہی اور تاریک مستقبل و حال کو روشن بنانے کی سعی کرتی۔ بعض اوقات اس ماحول سے بہت گھبرا جاتی اور یہ سوچتی۔ کہ کیا ان درخشندہ ستاروں میں بسنے والی اسی قابل تھی؟

میں نے اپنی اور رفیق زندگی کی مالی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے تمام معیاری اخبار و رسائل بند کرا دیئے۔ اور ہر طرح کی علمی دلچسپیاں ختم کر دیں کہ ان کی بار خاطر نہ ہو۔

گرمیوں کی ایک رنگین رات تھی۔ ماہ کامل اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جھلملاتا ستاروں کے جھرمٹ میں جلوہ گر تھا۔ اور اس کی ضیا پاشیوں سے وہ بے کیف اور ڈراؤنی بستی بقعۂ نور تھی۔ میری نند نے ایک بدوضع چارپائی پر ایک کثیف بستر لا کر بچھایا۔ سرسوں کے تیل سے چکنا پتھر کی طرح سخت تکیہ وہ سر کے نیچے رکھ کر سو گئی۔

میں اس غیر مانوس ماحول میں آکر ان انسانوں کی طرزِ زندگی دیکھ کر بہت حیران تھی نہ معلوم میں کب تک تقدیر کی تاریکی میں شمعِ تدبیر روشن کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہی اور پھر سو گئی!

پچھلے پہر عجیب آوازوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں گھبرا کر اٹھی اور سامنے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہلکی چاندنی میں کچھ جانور چلتے نظر آئے "ہارون" جو مجھ سے پہلے جاگ کر ان کو دیکھ رہے تھے کہنے لگے یہ کھیتوں میں "خنزیر" ہیں جو فصل برباد کرنے کو آجاتے ہیں۔ یہ سن کر میرا سر خود بخود جھک گیا اور میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ جی چاہا بھاگ جاؤں اس کثیف بستی سے لیکن پھر خیال آیا میں بیوی ہوں ہارون کی "جیون ساتھی" مجھے تمام زندگی ان کے ساتھ بسر کرنی ہے۔ پھر سوچنے لگی میں کیسی کم نصیب ہوں کہ اس نورانی وقت میں مؤذن کی صدا اللہ اکبر سننے کے، آبشاروں کے ترنم، کلیوں کی چٹک، پھولوں کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے ان درندوں کی مکروہ آواز غلیظ صورتیں دیکھ اور سن رہی ہوں جو مذہب اسلام میں قابلِ نفرت جانور ہیں۔

قسمت نے میرے ساتھ فطرت کی دیگر فیاضیوں کو عطا کرنے سے بھی سخت بخل سے کام لیا۔ نہ حسین مناظر نہ کچھ دلچسپی، نہ کوئی دلچسپ شغلِ زندگی، سوچنے لگتی زندگی کے یہ طول طویل دن یہاں کیسے بسر ہونگے؟ میں بہت پریشان تھی۔ کیونکہ ہارون بھی تعلیم یافتہ، روشن خیال اور لطیف جذبات کے مالک نہ تھے ان کی شہرت بھی اچھی نہ تھی۔ مگر

میرے لئے مجازی خدا ہونے کی صورت میں وہ سب کچھ تھے ہارون کی خوشنودی کے لئے جانِ عزیز کو بھی قربان کر دینا میرے نزدیک ایک معمولی ایثار تھا۔ میں اکثر اپنی محرومی قسمت پر اس قدر روتی کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ اب میری آنکھوں میں کوئی قطرہ اشک باقی نہیں رہا۔ میں شادی سے پہلے ازدواجی زندگی کو سراپا نکہت و لطافت سمجھتی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے جب میں فردوس شمیم کی شادی پر گئی تھی اور رخصتی کے وقت دولہا کی بہنیں نسیم (دولہا) کو آرسی مصحف کے لئے کمرہ میں لائیں تو نسیم کا طرزِ گفتگو، جذبات کی پاکیزگی و نزاکت عجیب لطافت سے معطر تھی۔ نسیم اور شمیم کی یگانگت قلبی کا اندازہ کر کے میں بہت مسرور تھی۔ نسیم نے اپنے کلام کے ایک بہترین مجموعے کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے ادبی دنیا میں پیش کیا تھا تو میں انتساب کی عبارت سے سمجھ گئی تھی کہ یہ عنایت نسیم نے میری محبوب شمیم پر کی ہے۔ نسیم نے لکھا تھا۔

"میں معنون کرتا ہوں اس حقیر مجموعے کو تمہارے نام سے
جس کو وضاحت کے ساتھ سپردِ قلم کرنا مسلکِ محبت کا گناہ
سمجھتا ہوں تم اسے قبول کرو اور گلستانِ شعر و ادب میں گلہائے
عطر بیز کی عنبر فشانیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے کے بجائے
میرے دل کی گہرائیوں میں شمیم روح نواز بن کر سما جاؤ!"

اس کے بعد پھر شمیم نے اپنی ایک نظم کا تہدیہ ان الفاظ میں

شائع کرایا تھا:۔

"میں اس نظم کو منسوب کرتی ہوں تمہارے نام سے جس کی ایمائی کیفیتیں ترکیب پاتی ہیں غنچے کے تبسم رفیق اور شبنم کی خنک لطافت کے امتزاج باہمی سے، اس سے پہلے کہ صبح کی تمنا زا کیفیات کے زیر اثر تم پھولوں کے آغوش سے بیدار ہو کر چمنستان میں سرسراتے نکلو میرا پیام "روحِ نسیم" کے دوشِ پرگوشِ دل سے سنو!!"

آرسی مصحف کے وقت نسیم نے کچھ نوٹ شمیم کی گود میں پھینک کر کہا۔ "یہ کاغذ کے ٹکڑے میری محبت اور عقیدت کی توہین کریں گے۔ سفید گلاب کا ایک شگفتہ پھول شمیم کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگا یہ ہے

"گلستانِ محبت کا ایک نکہت بیز تحفہ"

اس وقت میرے دل نے نسیم کی ارفع شخصیت کی داد دی اور میں ہر دولھا کو نسیم جیسا لطیف شاعر ہی سمجھتی تھی۔ نیلگوں ریشمی پردے کے پیچھے کھڑی میں سوچ رہی تھی کیا میری زندگی کا نیا دور بھی ایسا ہی ہوگا؟

میری ازدواجی زندگی کے خیر مقدم کے لئے ایسے ہی لطیف و منزہ الفاظ سامع نوازی کریں گے؟ میری زندگی کو یہ نئے کرشمے زیادہ پُر مسرت بنا دیں گی؟ مگر نہیں میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ ایک خواب تھا!!

میں ازدواجی زندگی کو کلیوں کے حسین تبسم، آبشاروں کے لطیف ترنم سے

تشبیہ دیتی تھی لیکن یہ زندگی شیطان کے قہقہوں سے زیادہ کرخت، مزدور کی آہوں سے زیادہ الم ناک نکلی۔!

میں عہدِ ماضی کے ان ایوانوں کو دیکھتی جو میں نے اپنے چشمِ تخیل سے سربفلک بلندی پر چڑھائے تھے جن کی تخلیق و تعمیر میرے تصورات نے کی تھی مگر اب حقیقت کی دنیا میں آکر "ہارون" نے اس عمارت کو منہدم کر ڈالا اور اُس کی زبردست ٹھوکروں نے انہیں چکنا چور کر دیا اور میں اُس پرند کی طرح خاموش رہی جس کے بال و پر صیاد نے تیز مقراض سے کاٹ دیئے ہوں میں نہایت تندہی سے خانگی کاموں میں مصروف رہتی سب کام اپنے ہاتھوں سرانجام دیتی اور ایسے ایسے کام کرتی جو کبھی خواب و خیال میں نہیں آئے تھے ہارون کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا جس موٹر کے وہ ڈرائیور تھے اُس کو آگ لگ گئی تھی۔ میں نے اپنا زیور ہارون کو دیا کہ اس کو بیچ کر کوئی معقول کاروبار کریں اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دی!!

ہارون کی اتفاقِ رائے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی میں نے عید میلاد نبی کی محفل منعقد کی سب کمرے صاف کیے اپنا مخصوص آسمانی رنگ کا لباس پہنا۔ صحن سے بد وضع درخت اکھاڑ کر ہار سنگار کے پودے لگائے اور سدا بہار پھولوں کی کیاریاں بنائیں یاسمین کے پھول چنے اور انہیں مسہری پر بکھیر دیا۔ جن کی خوشبو سے تمام کمرہ مہک گیا۔ اتنے میں ہارون آئے اور بڑے رعب سے فرمایا یہ بستر تو جھاڑ دیا ہوتا میں نے حیرت سے دیکھا وہاں کیا تھا؟ صرف یاسمین کے مسکراتے پھول جو میری لطافتِ ذوق

کا تمسخر اُڑا رہے تھے۔

ہارون کے خیالات سے مجھے بڑا اختلاف تھا۔ میں اگر اُن کے ساتھ کوئی ادبی بحث کرتی یا کسی مضمون پر تنقید کرتی تو وہ کانوں میں اپنی لمبی پنسل ٹھونس کر اپنا حساب دیکھنے میں مصروف ہو جاتے۔

ہارون "درخشاں نگر" چلے گئے تھے وہاں جا کر انہوں نے دکان کا کام شروع کیا۔

خاتون حمیرا نے مجھے شادی کے بعد پہلی بار دیکھا اور حیران ہو کر کہا تم کس قدر کمزور ہو گئی ہو۔ اس کے اس اظہار نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میری صحت گر گئی ہے۔ مجھے فکر ہوئی کہ اگر کسی مرض میں گرفتار ہو گئی تو پھر میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ موت تو اپنے وقت معین سے پہلے آتی نہیں یہ سوچ کر میں بغرض علاج ہارون کے پاس "درخشاں نگر" چلی گئی۔ وہ دکان پر بیٹھے بڑے کاروباری انداز سے ترازو پر کوئی چیز تول رہے تھے۔ ان کے کپڑے دھول سے اٹے تھے اور چہرہ سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔ اس حالت میں ان کو دیکھ کر مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اور میرے سامنے ہائیکورٹ کی ایک وسیع عمارت آ گئی جو میرے رنگین تصورات کا ایک دلکش خاکہ تھا۔ جب میں مکان پر آئی تو میرا دل بیٹھ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں سرد ہو چکے تھے!!

دوسرے دن میں ایک ہسپتال میں گئی۔ لیڈی ڈاکٹر کی تشخیص تھی

کہ میں ماں بننے والی ہوں اس لئے کمزوری بڑھ رہی ہے۔

ڈاکٹر کے ان الفاظ نے مجھ پہ تازیانہ کا کام کیا میں سوچنے لگی اب یہ بوجھ کون برداشت کرے گا؟ فرطِ الم سے میرے آنسو جاری ہو گئے اور میں لغزیدہ قدموں سے ہسپتال سے باہر آ گئی۔ میرے برقعے کا نقاب بھیگ چکا تھا اور مجھے اپنی بے کسی پہ رحم آ رہا تھا۔

ایک طبی کتاب کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اگر ماں اپنی خواہش کے مطابق غذا استعمال نہ کرے گی۔ تو اس کا اثر بچہ پہ پڑیگا اور اس کا کوئی اعضا مفلوج ہو جائے گا۔

ان دنوں مجھے انار بہت پسند تھے اگر میری جیب اجازت دیتی تو میں روزانہ کئی انار کھایا کرتی مگر میں مجبور تھی۔ آخر ہارون سے انار کی فرمائش کی۔ ایک دن ہارون انار لائے اور میرے ہاتھ میں دے کر خالص بازاری انداز سے بولے۔ "چونی میں لایا ہوں ایک" بہت مہنگے ملتے ہیں۔ !!

اس کے بعد پھر میں نے کبھی انار کی فرمائش نہ کی البتہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ اگر بچہ کے کسی اعضا میں کوئی نقص پیدا ہو گیا تو کیا زمین پہ ایک اور بوجھ کا اضافہ نہ ہو گا؟

میری زندگی کا یہ بھیانک سال ختم ہو گیا۔ اور میں "ماں" بن گئی خودکشی کو میں تکلیف، مصیبت، اور دنیاوی حادثوں سے نجات پانے کا ایک ذریعہ سمجھتی تھی۔ موت کا تصور میرے نزدیک بھیانک نہ تھا۔

میں موت کو ایک ابدی سکون اور مسلسل امن جانتی تھی۔ میرے نزدیک موت زندگی کی آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان کشمکشِ حیات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اور پھر دنیا کے مکر و آلام اس کی روح کو مضطرب نہیں کر سکتے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی موت ہے کیا؟ بس انسان کا آخری سفر۔ زندگی کی آخری منزل اس کے بعد تاریکی اور ایک دوامی زندگی ہو گی جس سے انسان احساسات سے آزاد ہو گا!!

مجھے حیات دوامی نہیں چاہیئے میں تو چاہتی ہوں کہ موت جسم اور روح دونوں کو فنا کر دے اگر روح فنا نہیں ہو سکتی تو اتنا ہو قوت احساس چھن جائے اگر دنیاوی مصائب کی یاد نے مجھے اس زندگی میں بھی تڑپانا ہے تو پھر موت و حیات میں فرق کیا؟ خودکشی کو میں زندگی سے مجبور انسان کے لئے ایک نعمت جانتی تھی مگر ایک حسین معصوم نے میری گود میں آکر اپنے ننھے ہاتھوں سے میرے گلے سے موت کا پھندا نکال دیا اور قدرت نے میرے دل کو جذبہ "مامتا" سے معمور کر دیا۔ جس نے مجھے خودکشی کے بدترین ارادے سے روک دیا۔

طارق سے مجھے بہت محبت ہے میرا بہت وقت طارق کی پرورش اور اس کے خیال میں گزرنے لگا۔

تین سال میں تین بچوں کی ماں بن گئی اور یہ معصوم میری تنہائی۔ حرماں نصیبی کے حسین کھلونے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرنے لگے!

ہارون بعض حالات کی بنا پر اپنے کاروبار کو فروغ نہ دے سکے۔

اور دوکان بند کر کے اپنے گاؤں "کنج اذیت" میں واپس آ گئے۔ گھریلو مصروفیتیں میرے چاروں طرف اژدھا کی طرح منہ پھیلائے بکھری پڑی تھیں سارا دن خانگی کاموں اور کئی طرح کی پریشانیوں میں گزر جاتا۔

بعض وقت گرد و پیش کے حالات، واقعات بھی دل و دماغ کو اس قدر متأثر کر دیتے ہیں کہ انسان غیر موضوعات پر اظہارِ خیال کے لئے مجبور ہو جاتا ہے ——— آہ! کتنے کرخت انداز میں ... محترمہ نے لڑائی کی اور حبشی خانہ زاد کو غلیظ الفاظ کہے کہ اُن کے باغ سے شہتوت کے پتے توڑ کر بکری کو کیوں کھلائے ——— !!

سارا دن میرے تخیلات نامعلوم کس طور سے گردش کرتے رہے شام کو میں اخروٹ کے سائے میں بیٹھ کر ہارون کا انتظار کرتی رہی وہ آج بھی واپس نہ آئے میں اس غلیظ ماحول میں اس تاریک تنہائی میں سوسائٹی کو ترس گئی رات گئے تک ٹہلتی رہی خوف و دہشت سے نیند نہ آتی تھی اس وحشتناک سناٹے میں "ریکس" کی گرجدار آواز پہاڑوں سے ٹکرا رہی تھی جب آثارِ سحر نمودار ہوئے تو میرا خوف بتدریج کم ہوا اور میں سو گئی۔ !!

صبح ہارون واپس آئے وہ تازی اور ریحان کے تلخ سلوک سے بہت اُداس تھے۔ اُن کے بے پایاں حسد سے ہارون رنجیدہ تھے۔ گھی کی خرید اور چینی کی تقسیم کا مسئلہ ان کی آتشِ حسد کو بھڑکا رہا تھا۔ اُف ہم انسان ایک خون کے پروردہ دوسرے کو امن کا سانس لیتے دیکھ

کر کیوں تڑپ جاتے ہیں ؟

بغض، حسد، کینہ، عداوت کتنی مکروہ آلائشیں ہیں جو انسانی سینہ میں مضمر رہتی ہیں۔ اور پھر ہمیں اشرف المخلوقات کا دعوےٰ ہے رات کو دیر سے سونے کے باعث صبح میری آنکھ دیر سے کھلی سر بہت بھاری تھا۔ گھر کا سب کام ختم کیا اور پھر سامانِ سفر درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تھکاوٹ سے حالت ابتر تھی۔ سارا دن کس طرح گزرا کچھ پتہ نہیں !!!

شام کو اخروٹ کے سایہ میں بیٹھی فلسفہ حیات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مایوسی، ناکامی، مجبوری، پریشانی، غمگینی اور کوفت شائد یہی انسانی زندگی کے چند نمایاں پہلو ہیں۔ صبح میں نے "کنج عافیت" میں جانا تھا۔ شام کو میں اپنی جنت میں پہنچ گئی۔

روبیؔ، نسیمؔ، طارقؔ، بلبل کی طرح چہک رہے تھے۔ یہاں آکر اس محبت کی وادی میں مجھے ایک رسیلی آواز نہ سنائی دی۔ کائنات کی مختلف آوازوں میں میرے کان اُس شیریں آواز کو ڈھونڈتے رہے میں سوچنے لگی۔ کہ یہ تمام دن رات اُس کے بغیر دردِ فرقت میں کٹ جائیں گے؟ اُف ! زندگی اور زندگی کی یہ بے کیفی کیا زندگی کے دامن سے یہ داغ چھٹ سکیں گے ؟

اختلاج قلب کے دوروں نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا تھا آج طبیعت مائل بہ اضطراب تھی۔ بخار بھی ہو گیا۔ اس کی تیزی سے مدہوشی

طاری رہی اور پھر نہیں معلوم کس وقت سو گئی. جب آنکھ کھلی تو سورج نکل رہا تھا آسمان کے کنارے زرّیں تھے اور درمیان میں بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے میرے خیالات کی طرح منتشر اور پراگندہ —!!! تبسّم نے مجھے بتایا کہ بوڑھی زیتونؔ، انجمؔ اور طارقؔ سے لڑ کر بی نصرتؔ کے گھر چلی گئی. کیونکہ زیتونؔ سوئی ہوئی تھی اور انجمؔ و طارقؔ نے اُس پہ فوارہ سے پانی گرایا اور شور مچایا۔ کہ بارش ہو رہی ہے۔

بوڑھی زیتونؔ دن بدن عقل سے خارج ہوتی جا رہی ہے. مجھے اُس غریب پہ رحم آیا. بڑھاپا بھی قدرت کی طرف سے ایک زبردست سزا ہے!

والدہ ماجدہ اپنی زمینوں میں "زاویہ فردوس" گئی ہوئی تھیں میں نے بی زیتونؔ کو "نصرت بی" کے گھر سے بلوایا۔ وہ بچاری غصہ اور اشکباری سے کانپتی ہوئی آئی. میں نے انجمؔ اور طارقؔ کو ڈانٹا اور بی زیتونؔ کو خاموش ہونے کی التجا کی. لیکن وہ برابر بکتی جھکتی رہی آخر تھک کر چپ ہو گئی۔

میں بخار کے عالم میں صحن میں دراز تھی. کہ صوفیؔ بڑھیا کے بگڑ جانے کی اہمیت معلوم کرنے آئے اور میری حالت پوچھے بغیر اندر چلے گئے. میں حیران رہ گئی ان کی اس بداخلاقی پر بعض انسانوں کی حقیقت نے مجھے تلخ سے تلخ تجربات سے دوچار کیا. پتہ نہیں کیوں ان کو میری ذات سے للٰہ بغض ہے!!

معبود انسان کی فطرت کتنی کمزور ہوتی ہے اور بعض انسانوں کی بودی ریاکارانہ دلفریب تسلیاں کاش انسانی زندگی میں یہ مکر و فریب کی آلائشیں

نہ ہوتیں یا انسان کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا اور اس کی احساس کی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ اخبار کی ایک سُرخی نے مجھے متوحش کر دیا تھا۔ خیال بار بار ندیم کی طرف چکر لگا رہا تھا۔ میرے اللہ میرے ماحصل امید بھائی کو زندہ سلامت رکھنا اُس کی برق پاش تلوار غنیم کی تلوار سے ہمیشہ بلند اور خون آشام رہے اس کی زندگی مستقبل میں ایک مسرور اور کامیاب زندگی ہو۔

ایک بدخواہ کی پیشین گوئی نے مجھے مجروح کر دیا اُس نے کہا کہ یہ کس اُمید پر مگن ہے۔ اعجاز یوں چھین لیا گیا۔ ندیم موت کے منہ میں جا چکا۔ طاہر ٹی بی کا مریض ہو گا۔ یا اللہ! کیا یہ انجام ہو گا میری درخشاں وادی محبت کا؟

نہیں قدرت بڑی مہربان ہے وہ کبھی میری آرزوؤں، چمکتی امیدوں شگفتہ تمناؤں کو فنا نہیں کرے گی۔ میرے بھائی زندہ سلامت رہیں گے اور ان کا نام شہرت کے آسمان پر جگمگائے گا۔ اُن کا آفتابِ عزت کبھی غروب نہ ہو گا یہ حاسد، بخیل، مکار اُن کے حسین قدم چومیں گے ؎

بدلے گا اِک دن دورِ فلک مایوس یہ ہم تم ناحق ہیں
گلزار میں ہے پھولوں کی مہک افلاک پہ تاباں انجم ہیں

اعجاز میرا بھائی ہے میں اپنی دنیائے محبت کے بارے میں کبھی کوئی غلط بات نہیں سن سکتی اُس کی زندگی کے سُرخ خون میں کوئی لاکھ سفیدیاں ملائے وہ ہے تو میرا بھائی! پانی کے تیز بہاؤ میں کوئی چھڑی مار کر پانی جدا

نہیں کرسکتا“ ــــ !!!

ہارون پھر کسی کام میں شرکت کے لئے جب ”عشرت نگر“ جانے لگے تو میں نے ان کی خدمت میں باقی یادگار زیور بھی پیش کر دئے۔

بہت دنوں کے بعد ندیمؔ کا خط آیا۔ وہ خط جس کے آگے جگمگاتے الماس اور دہکتے انگاروں کی طرح یاقوت بھی ہیچ ہیں میں اس دنیاوی دولت کو انمول نہیں سمجھتی۔ انمول ہے یہ خط جس میں ہمدردی کے کلمات لکھے ہیں میرے نزدیک دنیا کا بہترین فرد وہ ہے جو اپنے پہلو میں ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔ میری مجروح اور تھکی ہوئی روح نے اس خط کو پا کر اطمینان حاصل کیا۔

ان دنوں مجھے روحانی اور جسمانی دونوں آزار تھے۔ ندیمؔ کے خط نے مجھے بہت تسکین دی۔ سچ ہے ہمدردی سے لبریز دل باغ ہے ہمدردانہ خیالات جڑیں، ہمدردانہ الفاظ پھول، ہمدردانہ کلام پھل۔ واقعی ہمدردی سے لبریز دل لعل وجواہر سے بدرجہا بہتر ہے۔ دکھ، تکلیف، مصائب کے لہریں لیتے ہوئے سمندر غم میں کسی کا ہمدردی سے نکلا ہوا فقط ایک لفظ کس قدر باعث سکون ہوتا ہے کہ کروڑہا درِّ نایاب اس کے آگے ہیچ ہیں!!!

میں زندگی اور اس کی پیچیدگی سے بہت گھبرا گئی۔ غم سے نڈھال ہو کر مغربی جانب کے دریچہ میں بیٹھ گئی۔ نیچے برآمدہ میں تازی ریحان صوفی یہ سب بیٹھے اپنی فطرت کے مطابق زہر افشانی میں مشغول تھے اور چچا جعفر ہنس رہے تھے۔ میں انسانی فطرت پر غور کرنے لگی یہ

بندے اپنے ہمجنسوں کو کسی صورت چین نہیں لینے دیتے۔
کیا سوسائٹی کا نام ہے تصنع، بناوٹ، کھوکھلی ظاہر داریوں اور نرے چھچھورپن کا؟؟
نکتہ چینی، حسد، خود پرستی سوسائٹی کے طرہ امتیاز ہیں؟؟
ایک مفسد نے چند بے بنیاد الزامات جو بیرونی اثرات رکھتے تھے مجھ پر تھوپ کر اعجاز اور والد بزرگوار سے میرا نام لے دیا۔ مجھے یہ سُن کر افسوس ہوا۔ کہ خدا نے معمولی اخلاق اور انسانیت سے بھی اس کو محروم رکھا۔ اگر وہ انسان ہوتا۔ تو اس دروغ گوئی سے محترز رہتا۔ میرے دل میں اس کی اس مفسدانہ حرکت پر اس کے لئے رحم کا جذبہ قوی ہو گیا۔ اور دل میں دعا کی کہ خدا اس کی عاقبت اچھی کرے اور نیکی کی توفیق دے۔
میں بچوں کو "کنج عافیت" میں چھوڑ کر دل پہ ہاتھ رکھے "کنج اذیت" میں آگئی اس ظلمت کدہ میں رات ہو جانے کے باعث بہت اندھیرا تھا۔ بند کمروں سے ٹٹول کر لمپ روشن کیا اور ایک کتاب لے کر لیٹ گئی۔ دُکھ اور سکھ دو لازم ملزوم چیزیں ہیں دونوں کو قرار نہیں لیکن ان دنوں کی تلخ یاد ہمیشہ تڑپاتی رہے گی!!۔
روبی۔ سیمی۔ طارق بے طرح یاد آرہے تھے۔ مگر میں ان کو مجبوراً ہمراہ نہیں لائی۔ مکانوں کی لپائی، فصلوں کی کٹائی کا کام شروع تھا۔ ہاردن ابھی تک عشرت نگر میں ہی تھے۔ میرے خیالات اُلجھے اُلجھے اور

روح مضمحل تھی اگرچہ یہ میں جانتی تھی کہ زندگی حادثات سے لبریز ہے اور پیہم جدوجہد ہی مقصد زندگی ہے مصائب کی تاریکی میں ہی شمع زندگی فروزاں ہوتی ہے اور زندگی سے کھیلنا ہی مقصد حیات ہے!!

گاؤں میں دوسرے زمینداروں کے باغ دیکھ کر مجھے بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ میرا بھی کوئی باغ ہو اور یہ آرزو پوری کرنے کے لئے بہت سے پودے پھل دار درختوں کے لگائے جن کی حالت پانی روک دینے سے خراب ہو گئی۔ ایک دن میں نے سب پودوں کی صفائی کی کیاریوں سے گھاس نکالی۔ تمام کانٹوں اور خار دار جھاڑیوں کو آگ لگائی میں اس کام میں مشغول تھی کہ رونے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں معلوم ہوا۔ بچارا لنگڑا چمار مر گیا۔ موت اور پھر غریب کی موت کتنا المناک سانحہ ہے معصوم یتیم کس درد سے چیخ رہے تھے۔ مالک یہ دنیا اور اس کی عارضی رنگینیاں سب ایک خواب ہیں۔ زندگی کے جگمگاتے ستارے موت کے سیاہ بادلوں میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتے ہیں اور یہ بوڑھا آسمان ایسے ہی کھیل کھیلتا ہے!

"درخشاں نگر" میں بہترین درسگاہیں بنی ہیں اور ہر طرح ضروریات زندگی کا بہترین انتظام ہے۔ میں بچوں کو تعلیم دلانے کا مستقل ارادہ کر کے "درخشاں نگر" آ گئی۔ اور بچوں کو اسکول میں داخل کر دیا۔

ہارون بغیر کوئی فائدہ حاصل کئے عشرت نگر سے واپس آ گئے تھے۔ میری ضروریات زندگی میں بہت سی تکلیفیں حائل ہو رہی تھیں

مگر میں ثابت قدمی سے راہِ حیات استوار کر رہی تھی بعض وقت تنگ آکر احساس "خودی" مٹا کر یہ ارادہ کرتی تھی کہ اس کٹھن منزل میں صاحبزادی فوزیہ سے معاونت کی التجا کروں مگر دل کہتا تھا ؎

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا

صاحبزادی فوزیہ نے میرے خط کا جواب دینا پسند نہیں کیا اب وہ مجھ ناچیز کی مدد کریں گی؟ فوزیہ اپنی فیاضی کے مظاہرے قومی یونیورسٹیوں ملکی ہسپتالوں اور لاکھوں محتاجوں کو چندہ دے کر کرتی ہیں۔ جہاں تالیوں اور مرحبا کے نعروں سے محل گونج اٹھتا ہے میری یاد انہیں کیسے آئے گی؟

یہ خیال آنے پر میں نے دستِ سوال پھیلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔!!

بچوں کی پڑھائی میں کئی طرح کے اخراجات مجھے بہت پریشان کر رہے تھے اور ہارون ان بڑھتے ہوئے اخراجات کو دیکھ کر لڑکیوں کی تعلیم بند کرانا چاہتے تھے۔ وہ شروع سے ہی لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ مگر میرے خیال میں لڑکیوں کے لئے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو ان کے ماحول کی ضرورتوں پر حاوی ہونے کے علاوہ ان کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے شوہر کی بہترین جلیس ثابت ہوں اور ملکی وطنی تحریکات میں حصہ لے سکیں۔ وہ معاشی، اقتصادی اور سیاسی

مسائل کو سمجھیں۔ اُن پر غور کریں اور ان کو حل کرنے میں مردوں کی ہم آواز بن سکیں۔ کیا یہ سوچنے کا مقام نہیں؟ کہ جب ہمارے ملک کے نوجوان یونیورسٹیوں سے تعلیم سے فارغ ہو کر انعامی تمغے حاصل کر کے اپنے گھر آتے ہیں تو ان کو جب جاہل بیوی سے سابقہ پڑیگا تو اس کی زندگی کس قدر تلخ ہو گی۔

جاہل بیوی کس طرح اس کے جذبات وخیالات سے ہم آہنگی پیدا کر سکتی ہے۔ اُن گہرے مسائل کو جو دن رات اس کو پیش آتے ہیں کیا سمجھ سکتی ہے اور ان کی داد دے سکتی ہے۔ تعلیم اناس کی کمی نے ہماری جماعتی زندگی میں یہ خامی پیدا کر رکھی ہے۔ کہ عورتیں اولاد کی تربیت میں خاطرخواہ حصہ نہیں لے سکتیں۔ بچوں کی تربیت اور غور و پرداخت ماں کے ہاتھ ہوتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ نہیں ہے تو پھر وہ بچوں کے لائحہ تعلیم میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لے سکتی۔ ذہنی تعمیر میں جتنا ہاتھ ماؤں کا ہوتا ہے باپ کا نہیں ہو سکتا۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ بہت سے بچوں میں عادات واطوار ماؤں کے سے پائے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا یہ فرض نہیں کہ ہم حتی الوسع اس تعمیر میں حصہ لیں اور اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کریں۔ ایک عورت کی جہالت سے سینکڑوں زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس لئے میں لڑکیوں کی تعلیم کو بہت ضروری اور لازمی خیال کرتی ہوں۔ البتہ یہ چاہتی ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم لڑکوں سے جداگانہ طریق پر ہو اور دنیاوی تعلیم

کے ساتھ مذہبی تعلیم اور امور خانہ داری سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کریں۔

اس ملک میں ازدواجی نظریہ بہت تنگ ہے ایک دخترِ اسلام اپنی فطری قابلِ صد افتخار حیا کے باعث کبھی آزادی کے ساتھ اپنی رضا یا رائے کا اظہار نہیں کرتی اور سرپرست اس کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ کر ظلم و ستم کے تمام حوصلے پورے کر لیتے ہیں!!

ہمارا طرزِ عمل اس کی ذہنی کیفیت کو کسی طرح منقلب نہیں کر سکتا۔ اگر مذہبیت کے پورے خلوص کے ساتھ سوچیں تو اس قسم کی جبری شادیاں جائز نہیں ہوتیں!!

مذہب اسلام نے تو ازدواجی معاملات میں طرفین کی آزادی رضا کو لازمی رکھا ہے اور شریعت میں اس کے متعلق جو احکام ہیں ان کی روشنی میں بلاخوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر طرفین کو زبردستی مجبور کیا جائے تو وہ شادی جائز نہیں ہو سکتی۔ یوں ہم جو چاہیں کہہ لیں!!!

ازدواجی زندگی کا مفہوم سماج کے قانون دان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ دو نوجوان ہستیاں یا ایک سن رسیدہ اور ایک کمسن ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ کو باہم رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے خواہ اُن کے مذاق، خیالات و طبع میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو!!!

ہیں اپنے مستقبل کو سنوارنے بچوں کو تعلیم دلانے کے خیال اور کوشش میں افکار کی چکی میں پس گئی۔ دیگر آسائش زندگی تو درکنار بچوں کو اچھا کھانا نہیں مل سکتا۔ مگر میں نے ان کے دماغ میں یہ بات ذہن نشین کرا دی ہے کہ علم کی دولت کو بھوک کی سختی بھی برداشت کر کے حاصل کرنا ہوگا۔!!

"درخشاں آباد" میں میں نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا اور اس کے آگے پھولوں کے پودے لگائے جن میں گلاب خصوصیت سے تھا۔ کیونکہ یہ تمام پھولوں کا بادشاہ ہے۔ اس کا سونگھنا فرحت بخش ہے۔ اس کا عرق پینے سے آواز میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس کا عرق ناک میں ڈالنے سے نکسیر کا خون بند ہو جاتا ہے۔

اپنے اس گھر کی صفائی اور دیکھ بھال میں ہر وقت مشغول رہتی۔ خلاف توقع کئی تکلیفوں کو برداشت کرتی کہ میرے بچے میدان علم و ادب میں ممتاز اور سرفراز ہوں۔ لیکن دنیا ایثار پرست انسان کے لئے جہنم ہے۔ جس کسی نے اس جہاں میں بھلا کیا زمانہ نے اس سے برا سلوک کیا جو شخص جس کے لئے برباد ہو جاتا ہے اپنی جان تک بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ یہ محسن کش اس کے احسان کو فراموش کر کے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ میرے معبود کتنا تلخ ہے زلیبت کا یہ تجربہ۔ ہر دن اپنے کاروباری نقصانوں سے تنگ آکر "درخشاں نگر"

کی گرانی سے اُکتا کر مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں بچوں کی تعلیم بند کرا کر گاؤں چلی جاؤں۔

اس سے پہلے میں مصائب و آلام کا مقابلہ خوشگوار اُمیدوں کے بھروسہ پر کرتی رہی تھی۔ لیکن اب میری روح بحر مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی ہے میری صحت دن بدن گر رہی ہے۔

ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا ہے۔ کہ ٹی بی کی تیسری منزل میں ہوں اب مجھے سینی ٹوریم میں داخل ہوجانا چاہیئے۔

ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ بچوں کو صاحبزادی فوزیہ کی سرپرستی میں جا کر چھوڑ آؤں۔ لیکن وہ فوزیہ جس کو اپنی فیاضی پر ناز ہے۔ اور جس کے بے شمار صدقات نے ہزاروں دامن گوہر مراد سے لبریز کئے ہیں اور میں زندگی بھر اس کی معاونت و تحریر کو ترستی رہی اور اس کی طرف سے ایک پرزہ کاغذ کی حقدار نہ بنی !!

وہ فوزیہ اب میرے بچوں کو کیا سہارا دے گی۔

میں نے اپنے تینوں جگر گوشوں کو اپنے سینہ سے لگایا اور ہارون کے ساتھ گاؤں بھیج دئے۔

میں کوہ یاسمین کے سینی ٹوریم میں داخل ہو گئی ہوں اور چپ چاپ اپنے آہنی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے گھٹنوں تک سرخ کمبل اوڑھے اپنی کتاب زندگی کا باب لکھ رہی ہوں۔

جس کی تحریک میری ہمراز زیست نرگس نے کی تھی۔ جو زندگی کے

بھرے میلے میں میرا ساتھ چھوڑ گئی اور یہ راستہ تیزی سے عبور کر گئی جس پر میں پڑی اب سسک رہی ہوں۔ میری زندگی کا جہاز وقت کے سمندر میں اپنی مسافت ختم نہیں کرتا اور میں نڈھال پژمردہ جسم لئے عرشے پر کھڑی ہوئی افسردہ نگاہوں سے موت کے ساحل کو لمحہ بہ لمحہ قریب آتے دیکھ رہی ہوں میرے کمرے کی فضا میں مختلف قسم کی دوائیوں کی بُو رچی ہوئی ہے۔ پہلے روز جب میں یہاں آئی تو یہ مجھے بے حد ناگوار معلوم ہوتی تھی لیکن آج یہ میرے پھیپھڑوں کا ایک جزو بن گئی ہے

بہت دنوں بعد ہارونؔ آئے ہیں قبل اس کے کہ وہ مجھے روبیؔ طارقؔ، سیمیؔ کی خیریت بتاتے اپنے کاروباری مسئلہ کو لے بیٹھے کہ اس طرح میں نے چھکڑوں کا انتظام کیا اور پھر مونگ پھلی، تمباکو، آلو وغیرہ کو کاشت کرنے کے لئے گاؤں پہنچایا۔ اُن سے میں کیسے کہتی کہ مجھے دہقانوں سے کوئی دلچسپی نہیں جو صرف لسّی، گھی اور تازہ دودھ میں ہی اپنی زندگی کا عکس دیکھتے اور اسی کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔

میرے قریب کے دریچے سے باہر جو پھول کھلے ہوئے تھے آج کی تیز دھوپ میں ان کی مخملی پتیوں کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ جیسے ان کے پھیپھڑے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ آہ! باہمی نفرت اور دبے ہوئے شدید غیظ کی آگ نے مجھے جھلس دیا ہے اور میں اپنی

پریشانیوں اور قلبی سوز وگداز کو درختوں، پھولوں، ستاروں میں بکھیر کر بھی مطمئن نہ ہوسکی۔ اب میں اپنی نرگس کے پاس جانا چاہتی ہوں جو اپنے خطوں میں محبت کی پراسرار گفتگو کیا کرتی تھی۔ جس کے الفاظ شبنم کے بے داغ موتی تھے اور جو مجھے بادوں کے گھنے جنگل میں تنہا چھوڑ گئی۔

آہ! انسان کے لئے تنہائی کتنی ہیبت ناک سزا ہے۔ ہم خیالوں کے بغیر زندگی کا لطف نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ جس کے باعث انسان صحبت کا متلاشی رہتا ہے اور محفلیں منعقد کرتا ہے۔ انجمنیں قائم کرتا ہے اور پھر یہی صحبتیں، یہی محفلیں، یہی انجمنیں ایک مرکز پر آکر سماج یا سوسائٹی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ انسان ابتدائے آفرینش سے سماجی رشتہ میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کی زندگی سماجی تعلقات کی طویل کہانی ہے۔ سماجی شاہراہ کی پہلی پگڈنڈی خاندان ہے اور سماجی تعلقات کی پہلی کڑی کنبہ پروری ہے۔ خاندان کا ایک شخص اگر اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے تو وہ اپنے رسوخ سے کئی اشخاص کی بے روزگاری مٹا سکتا ہے۔ خاندانی اُنس فطری چیز ہے اور یہی جذبہ خاندان کا نام اونچا رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان دنوں مجھے صاحبزادی فوزیہ بے طرح یاد آرہی ہیں وہ میرے لئے کیا نہیں کرسکتی تھیں اُن کی ایک نگاہِ کرم میری نامرادیوں کو مراد مندی میں تبدیل کرسکتی تھیں۔ لیکن "فوزیہ" کے دماغ سے میرا خیال حرف غلط کی طرح مٹ گیا وہ میرے لئے کچھ بھی نہ کرسکیں، انہیں میری یاد کسی موقعہ پر نہ آئی۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی ہے۔ شائد وہ

میری خودداری کو مٹا کر دستِ سوال پھیلانے کو آمادہ کرتی ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایک غیور ہستی ہوں۔ میں کسی حالت میں خودداری کو نہیں توڑ سکتی۔ مجھے خودداری کی موت سے زندگی کی موت پسند ہے

میں اب ہمیشہ کے لئے مسرت اور خوشی کے پر رونق ایوانوں سے نکل گئی ہوں۔ خزاں اور الم ناکی کے سیاہ بادل میری زندگی کے اُفق کو لمحہ بہ لمحہ محیط کر رہے ہیں۔ میرا ذہن خالی ہے نہ کوئی آرزو ہے نہ تمنا نہ خوشی نہ رنج۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں ایک خلا میں ہوں۔ جہاں زندگی کو حرکت نہیں۔ جہاں ہر شے پر سکوت ہے، بے حسی ہے، جمود ہے اور موت ہے میں ایک پتھر کا بُت ہوں اور اس خلائی کائنات کو گھور رہی ہوں۔ صرف فوزیہ کی یاد میرے دل کی ہر دھڑکن میں بسی ہے۔ وہ میرے خوابوں میں چھائی ہوئی ہے۔ وہ میرے تصوّر میں یوں آتی ہے جیسے بہار آگئی۔ پھول ستارے بن کر چمکنے لگتے ہیں۔ کلیوں کی مسکراہٹ میں قوس و قزح کے ساتوں رنگ جگمگانے لگتے ہیں۔ اور مجھ میں ایک نئی روح آجاتی ہے!!

یہ چاند، یہ ستارے یہ وسیع نیلگوں آسمان کتنا دور ہے مگر کیسا اچھا لگتا ہے اسی طرح بیتے ہوئے دن جو ماضی کے بحرِ عمیق میں غرق ہو چکے ہیں مجھے بہت عزیز ہیں اور یہ یادوں کی ایک مقدس عظیم ترین امانت اب ایک خواب ہے۔

بعض خواب اندھیری راتوں کی یادوں میں پُر سحر واقعات سے سجے ہوئے سچے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس یقین کے سہارے میں صاحبزادی فوزیہ کی

یاد اور تصور میں بڑھتی چلی جا رہی ہوں اور میرے سامنے ایک وسیع کائنات پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک ایسی کائنات جو دلوں کی دھڑکنوں نظر کی نرم شعاعوں، آنسوؤں کی جھلملاہٹ سے تعمیر ہو رہی ہے اور میرے دل کی دھڑکنیں شدت احساس سے صاحبزادی فوزیہ کو پکارنے لگتی ہیں۔

محبت، خلوص کتنی عجیب نعمت ہے کہ میں باوجود اپنی ویران تنہائی اپنے سپنوں کی موت، اپنی امنگوں کی بربادیوں کے یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں اس دنیا میں تنہا نہیں کوئی اور بھی ہے جو مجھ سے ہمدردی کرتا ہے۔ اور جس کے خیالوں میں میں بسی ہوں!!

کرنل زیدی کو مجھ سے بڑی ہمدردی ہے وہ موت پر زندگی کی فتح چاہتا ہے۔ اور میں زیست کی ہار چاہتی ہوں اور "موت کی فتح" دیکھئے اب کون جیتتا ہے!!؟

قدرت کا یہ مذاق میرے لئے کچھ معیاری نہیں۔ میں اور صاحبزادی فوزیہ ریاست "گل افشاں" میں اسی لئے ملی تھیں کہ پھر بچھڑ جائیں؟ سماج نے اور اس کے غلط طریقوں نے میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ ایک بہت اونچی دیوار جس کو پھلانگنا کسی جاپر در مشرقی عورت کا کام نہیں وہ دیوار کے ایک طرف ہے اور میں دوسری طرف۔ پتہ نہیں انسان مجبور زیادہ ہے یا مختار زیادہ!

انسان کبھی چنگیز بن جاتا ہے۔ کبھی ہلاکو اور کبھی مجنوں بن کر سسک سسک کر مر جاتا ہے اور کبھی یہ مکار اپنے ہمجنس کو غلام بنا کر تباہ کر ڈالتا ہے کوئی ایڈورڈ ہفتم بن کر تخت و تاج چھوڑ دیتا ہے اور کوئی شمع کی طرح جل کر فنا ہو جاتا ہے۔!!

لیکن فوزیہ میں تمہارے پیار کی شمع کو بجھنے نہ دوں گی اُسے میں اپنے مجروح دل کا خون دے کر روشن رکھوں گی میری صرف یہ آرزو ہے کہ اس ظالم دنیا کو چپکے سے کوئی جلا دے تا کہ اس کے اونچے اونچے سرخ شعلے آسمان کو بھی جلا ڈالیں اور خدا اپنے اس شاہکار کو بھی خاموشی سے جلتا دیکھتا رہے۔ مگر میرے جیسا انسان دنیا کو نہیں جلا سکتا ہاں دنیا اسے جلا دیتی ہے اور اس کی شمع زندگی جل کر بجھ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی کائنات پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ روز یوں ہی سورج نکلتا ہے دنیا کا ہنگامہ جاری رہتا ہے کسی کی آنکھ سے کچھ اشک رواں ہوتے ہیں۔ کوئی آہ بھر کر دل تھام لیتا ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے!!

معلوم نہیں میرے خواب بلبلے کی طرح کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ میری اُمنگیں خزاں رسیدہ پھولوں کی طرح کیوں مرجھا گئی ہیں؟ کوئی میرے دل کی ویرانی کو دور نہ کر سکا۔ کسی کو اتنی فرصت کہاں کہ میرے ان بہتے ہوئے آنسو کو پونچھے!!!

انسان جب اس نزعی وقت میں اس طول و طویل دنیا پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اس کو رنج ضرور ہوتا ہے شیکسپئیر کا قول ہے کہ مرحوم

کے لئے اس کے رشتہ داروں کا گریہ وزاری کرنا دنیا کی نگاہ میں مضحکہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ موت قدرت کی نادر اور بیش بہا عطیات میں سے ایک عطیہ ہے۔!!

موت دنیاوی عیش وآرام کے دلدادہ اور سرمایہ پرستوں کے لئے ایک خوفناک چیز ہے۔ لیکن اللہ سے ڈرنے والوں اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے والوں کے لئے ایک نایاب مرہم ہے جس کا فعل انسانی زندگی کے تمام ناسوروں کو بھر دیتا ہے۔ موت انسانی زندگی کو ختم نہیں کرتی بلکہ ایک دائمی زندگی بخشتی ہے ایک ایسی زندگی جس میں انسان گھبراتا نہیں جہاں امیر و غریب کا کوئی سوال نہیں۔ جہاں موت کی خاصیت ہر ذی روح کے لئے فانی نہیں بلکہ لافانی ہے!!

جب میں نے شمع کی کتاب حیات کو ختم کیا۔ تو رات آخری منازل طے کر رہی تھی آسمان کے سمندر میں چاند کی کشتی رواں تھی۔ ستاروں کا قافلہ محوِ خرام تھا۔ اور تمام دنیا نیند کے آغوش میں مدہوش تھی!!

میں شدتِ غم سے نڈھال ہو کر صوفہ پر بیٹھ گئی اور روئی جتنا رو سکتی تھی۔ جب طوفان اشک تھم گیا۔ تو اُٹھی اور اُس کاپی کو جو شمع کے شیرازہ حیات کی طرح بکھری ہوئی تھی اکٹھا کرتے ہوئے یہ سوچنے لگی۔ کہ کیا زندگی سیل رواں ہے اور اس کا مقصد صرف ساحل سے ٹکرانا ہے؟

آثار صبح نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے معبود مجھے توفیق دے کہ زیست کی بے اطمینانیوں کو اعتراف عبدیت سے سکون بخشوں۔

اتنے میں نسیم و کوثر مجھے لباسِ گل پہنانے آئیں۔ مگر میں بغیر کوئی بات کئے خاموشی سے باغ کے راستہ سے نکل کر اس پگڈنڈی پہ چل دی جو سیدھی سینی ٹوریم کو جاتی تھی۔

جب میں ہسپتال پہنچی تو وہاں کا سب سٹاف ایک طرف تیزی سے جا رہا تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا۔ کہ خواب آلود نظمیں پڑھ کر پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیلوں اور شاداب مرغزاروں کے بیداری میں سپنے دیکھنے والی ابدی نیند سوئی ہوئی تھی۔ اور اس کی لاش ایسے لگتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو ؎

حال میرا تھا جب دگرتب نہ ہوئی تمہیں خبر
بعد میرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں

وہ واقعات جو میرے دل پر کوئی نقش چھوڑے بغیر دماغ سے محو ہو گئے تھے۔ آتشیں حروف کی صورت میں اُبھر آئے۔ ٹھہرے ہوئے طوفان نے انگڑائی لی۔ سرد مہری کی راکھ تلے دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن گئیں۔ اور میں اُس ہستی کے خیال سے محبت کرنے لگی۔ جو زندگی بھر محبت

اور ہمدردی کا ایک لفظ سننے کے لئے تڑپتی رہی !!!

اُداس نگاہیں

مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ وہ ازلی ستم رسیدہ تھی۔ اس کا باپ سول میں کسی بڑے عہدہ پر فائز تھا۔ وہ میرے اُس دوست کی بیٹی تھی۔ جس کے ساتھ میرے گہرے تعلقات وابستہ تھے۔

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں کوہِ زرنگار کو جو اہمیت حاصل تھی وہ کسی سیاح سے پوشیدہ نہیں۔

"سیما" سے شادی کر کے میں اپنے آپ کو دنیا کا ایک خوش قسمت انسان تصور کرتا۔ یہ حسین وادی جہاں موسم گرما کے دن میں اپنی سیما کی رفاقت میں گزارنے آیا ایک ایسی جگہ تھی۔ جس کے دونوں جانب میلوں اونچے اونچے درختوں کے گھنے جنگل تھے۔ چرخ نیلوفری کی رنگین جھلکیاں اور خورشید کی منوّر شعاعیں وادی کو زمردی رنگ دے کر عجیب بہار پیدا کرتیں اس سبزہ زار سے کچھ دور جنگل کے ایک طرف ایک گاؤں آباد تھا۔

جو لوگ حسن پسند اور شاعرانہ تخیل رکھتے ہیں اور روحانی غذا

کو جسمانی غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کو چھوڑ کر کوہِ "زرنگار" میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں کسی قسم کی کثافت نام کو نہیں۔ یہ جگہ مصوروں، شاعروں اور ابتدائی ایام ازدواج منانے والوں کی محبوب قیام گاہ ہے اور ان لوگوں کے لئے جو شاعرانہ طبیعت نہیں رکھتے اس جگہ کوئی کشش نہیں۔ یہاں صرف حُسنِ فطرت کا مطالعہ اور تصوّر و فکر کا سامان ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں اپنے ناول کا ساتواں باب لکھ رہا تھا۔ کہ "سیما" سفید شیفون کے گاؤن میں ملبوس ننھی "فیری" کو گود میں لئے کمرہ میں آئی اور فیری کو میرے پاس میز پر بٹھا دیا اور خود باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برآمدے کی دیواروں پر پھیلی ہوئی بید مجنوں کی بیلیں اور سپید بادلوں میں چودھویں رات کا تیرتا ہوا چاند ایک حسین منظر پیش کر رہا تھا

میں لکھنے میں مصروف تھا۔ کہ "سیما" کے معطر لباس کی سرسراہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے قلم ہاتھ سے میز پر رکھ دیا۔ فیری جو سیما کی گود میں بیٹھی تھی ہاتھ پھیلا کر میری طرف لپکی۔ میں نے اُسے اُٹھاتے ہوئے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"سیما! یہ لڑکی پیدا کر کے تم نے اپنے حسن کی ایک زبردست توہین کی ہے۔ اتنی حسین ماں کی ایسی بدصورت بیٹی —— تمہاری گود میں اس وقت ایسی لگتی ہے۔ جیسے چاند کو گہن لگ گیا۔

"سیما" یہ سن کر شرما گئی۔ اور پھر ناگوار لہجہ میں بولی۔

نا صاحب! میری فیری کو ایسا نہ کہیں۔ یہ بڑی ہو کر چاند سے بڑھ کر روشن ہو گی۔

دوسرے دن "سیما" چنار کے درخت کے نیچے اپنی قریب الختم تصویر کو آخری نقوش سے مکمل کر رہی تھی۔ یہ تصویر ایک ایسے درخت کی تھی جس کو برق فلک نے گر کر تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ میں نے "سیما" کو چھیڑتے ہوئے کہا کیوں سیما! یہ برق ایسے خوبصورت درخت پر گرانے کے بجائے تمہاری مینڈک نما فیری پر نہیں گر سکتی تھی۔ ایسا نہ کہو آپ کے یہ مذاقیہ کلمات ایک باپ کے منہ سے نکلے ہوئے بیٹی کی شخصیت سوسائٹی اور سماج کی نگاہ میں ہلکی کر دے گی۔ سیما نے ترشروئی سے کہا۔!!

یہ سن کر میں محجوب سا ہو گیا۔ اور بات کا رخ بدلتے ہوئے "سیما" کا مرمریں ہاتھ پکڑ کر یہ کہتا ہوا چل پڑا۔ سیما آج درختوں کے اُس پار چکر لگاتا ہے پتہ نہیں نقاش فطرت نے اُس سمت کس وضع کی نقاشیاں تراشی ہیں۔

سیما مجھے چھوڑ کر کمرہ میں چلی گئی اور فیری کے سیاہ فام جسم کو قرمزی سوٹ میں لپیٹ کر خادمہ کی نگرانی میں دے کر اس کے گرد گھرے شوخ رنگوں کے کھلونے بکھیر کر اپنا سفید اونی جمپر جس پر بیضوی تراشش کی رنگین شیشہ کی قاشیں جڑی ہوئی تھیں اپنے نازک شانوں کے گرد پھیلا کر آئی اور اٹھلاتی ہوئی میرے ساتھ چل دی۔

چنار کے گھنے درختوں سے نکل کر ہم ایک ناہموار راستہ پر چلنے لگے سامنے ایک پتھر کے پیچھے ایک لڑکی بھینس کے پاس بیٹھی تھی۔ جو جنگلی کھٹے انار کو چیر کر روتی ہوئی مصنوعی آواز میں دوسری لڑکی کو پکار کر کہنے لگی۔

نوری میری بھینس ذبح ہو گئی۔ پھر خود ہی اپنے طفلانہ کھیل میں معصوم انداز سے ہاتھ بڑھا کر چیرا ہوا انار ایک طرف کرنے لگی جو کھیل میں اس کی ذبح کی ہوئی بھینس تھی۔ اتنے میں دوسری لڑکی نے اپنی چپٹی ناک پھیلا کر ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

افسوس! "زخشی" تم کل یہاں سے چلی جاؤ گی!!

زخشی نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اتنی مدت ہو گئی میں نے ابا، امی، آصف، صبوحی کو نہیں دیکھا۔ وہ کیسے ہوں گے؟ صبوحی نواب اسکول میں پڑھتی ہو گی وہ ڈاکٹر بن جائے گی۔ کاش! نانا ابا اب مجھے صبوحی کے پاس جا کر چھوڑ آئیں یہ سن کر نوری چڑ گئی اور کہنے لگی۔ کیوں زخشی نانی اماں تجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں پھر بھی تم یہاں سے جانا چاہتی ہو؟

میں تو سمجھتی تھی کہ تم ان ہواؤں کو اور میری دوستی کو چھوڑ کر سخت اداس ہو گی۔ نوری نے زخشی کو گلے سے لگا لیا!!

زخشی خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔ یا اللہ! میری امی خواب میں آ جائیں۔ اور آ کر نیند ہی نیند میں مجھے یہاں سے لے جائیں۔ جب

میری آنکھ کھلے تو صبوحی و آصف کو اپنے قریب دیکھوں۔

میں نے شرارت آمیز لہجہ میں سیما کو کہا۔ کیوں یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اُس کوئلہ جیسی نیری کو اس کی جگہ بٹھا کر اس سنگ مرمر جیسی حسین مورتی کو اُٹھا کر لے چلیں۔ تمہارے لئے کتنا فائدہ ہو کہ یہ اچھلتی کودتی باتیں کرتی کامنی صورت بیٹی تمہیں مل جائے۔

سیما نے اپنی حسین پیشانی پر بل ڈالا اور بے پرواہی کے انداز میں آگے بڑھ کر مجھے کہنے لگی۔ اس سے پوچھو یہ ہے کون؟

ہم دونوں اس کی طرف گئے قدموں کی چاپ اور سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے وہ لڑکیاں چونک پڑیں۔ نوری تو بھاگ کر پتھر کے پیچھے چھپ گئی۔ لیکن رخشی نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر ہمیں سلام کیا۔ جس کی انگلیوں کے ساتھ کھٹے انار کا سُرخ رس چمٹا ہوا تھا۔

سیما نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگی۔ کتنی مختلف ہے یہ بچی اپنے اس ماحول سے۔ پھر سیما نے اُس کا اور اُس کے باپ کا نام پوچھا۔ لڑکی نے بتایا کہ میرا نام "رخشی" ہے اور میرے ابّا جان سرفراز خان ہیں۔ اور یہاں میں اپنی نانی کے پاس ہوں۔ رخشی نے ابھی بات پوری نہ کی تھی کہ ایک سفید ریش بوڑھا آیا۔ اُس سے میں نے رخشی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی وہی کچھ کہا۔ جو رخشی نے بتایا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے اپنے دیرینہ دوست کی بیٹی اس

جنگل میں کیسے مل گئی؟
میں نے اس بوڑھے کو کہا کہ کل اس بچی کو لے کر کوہ زر نگار پر میرے بنگلہ میں ضرور آنا۔ لیکن اُس نے کہا یہ کل اپنے والدین کے پاس "گل افروز" چلی جائے گی۔

غروب آفتاب کا منظر جنگل و دشت میں قابل دید ہوتا ہے جس کا نقشہ یا تو مصوّر کی قلم کی طاقت کا رہین منت ہے یا پھر بغیر شاعر کے سہارے اظہار نہیں ہو سکتا۔ حضرت جوشؔ کے الفاظ نے کچھ ایسی ہی مصوّری کی ہے ؎

پارہ پارہ ابر سرخی سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں

اندھیرا ہو جانے کا احساس کر کے جب میں لوٹنے لگا تو سیما بولی اب واپس چلیئے۔ بیچاری "فیری" اکیلی ہے۔ میں نے اُسے چڑاتے ہوئے کہا اندھیرے میں تو تمہاری "فیری" بالکل اندھیری ہو گئی ہو گی۔ یہ سن کر سیما نے ایسا منہ بنایا جیسے اگر ین کونین اس کے منہ میں ڈال دی ہو میں بے ساختہ ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے سیما کا ہاتھ تھام کر چل پڑا دامن کوہ سے اپنی مسافت دھیرے دھیرے طے کر کے ہم اپنے بنگلہ پر پہنچے جو ایک اونچی جگہ تھا۔ کوہ زر نگار کے ایک گوشے میں کچھ آبادی اور چہل پہل تھی۔ ورنہ جس طرف دیکھیں دُور دُور تک جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ بندر، لنگور اکثر نظر آتے۔ تاہم پر تصنّع فریبی، مکّار، وضعدار

انسانوں سے یہ بے زبان بد قطع، بد وضع، بے ڈھنگی مخلوق مجھے اچھی لگتی تھی جن کے ظاہر سے جن کا باطن الگ نہیں

مفلس انسانوں کی وہاں کثرت تھی ان کو جسم ڈھانکنے کے لئے چیتھڑا تک نصیب نہ تھا۔ وہاں کے لوگ لکڑی چن کر فروخت کرتے تھے اور پیٹ پالتے تھے۔ یا رکشا کھینچنے کی مزدوری کرتے تھے۔ رکشا ایک قسم کی سواری ہے جس پر امیر لوگ بیٹھ کر سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں۔ رکشا کھینچنے والوں کے چہروں پہ بے کسی یاس حسرت افلاس کے ملے جلے تاثرات ملتے ہیں۔ دنیا کی صعوبتوں سے مسخ شدہ چہرے، مسکراہٹ جن سے کوسوں دور، ہنسی ان حرماں نصیبوں کے پاس نہیں پھٹکتی۔ ظلم و جور ستم کے امتیاز میں بھی ان میں صلاحیت نہیں یہ چلتی پھرتی جیتی جاگتی چلتی پھرتی لاشیں، یہ انسان نما حیوان جن کو کبھی امید سے کچھ زیادہ مل گیا تو ان کے چہروں پر ایک مہیب سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ اُف! کتنے مظلوم ہیں یہ لوگ!!

کوہ زر نگار میں آکر "سیما" بہت خوش تھی۔ ہم شہر کی پر تصنع بناوٹی، نمائشی اور عارضی دل لبھانے والی ہنگامہ پرور دنیا سے بہت دُور تھے۔

قدرت کی آزادی، عناصر کی رنگین چھیڑ چھاڑ حد حصر نگاہ جاتی سرسبز شاداب منظر، شعریت نواز ماحول ہم کو اپنی پناہ میں لے لیتے۔

وہاں کی خاموشی میں ایک قسم کا سکون تھا۔ اور ایک طمانیت !!
کاش ! یہ چیزیں ابدی ہوجاتیں وہاں وہ تحقیر و تمسخر آمیز ہنسی وہ بے معنی و مہمل مذاحیہ فقرے، وہ دل آزار طرزِ گفتگو، وہ دلدوز نشتر جیسے الفاظ نہ تھے !!
ہمیں ان سے نجات تھی وہ آپس کی سرگوشیاں نہ تھیں جو پیٹھ پیچھے شروع ہوجاتی تھیں، وہ نکمے بہتان، وہ بے پناہ تہمتیں وہاں نہ تھیں۔ صرف اُن کا ڈسنا یاد تھا۔ !!!
میں اور سیما جب فیری کے کمرہ میں داخل ہوئے تو وہ اپنی سیاہ آنکھیں بند کئے سوئی ہوئی تھی کمرے میں بالکل اندھیرا تھا یہ دیکھ کر سیما تڑپ گئی اور اُس کا پھول سا چہرہ غصہ اور گھبراہٹ سے زیادہ گلابی ہوگیا۔ اُس کے ہونٹ گلاب کی پتی کی طرح کانپ رہے تھے میں نے خادمہ کو پکارا وہ مچھلی کا ایک پیس کھاتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف سے آئی۔ سیما نے بے تاب ہوکر فیری کو آسمانی شال میں لپیٹ کر گود میں لے لیا تھا۔ اُس نے خادمہ کو ملامت کیا کہ تو نے اندھیرے میں تنہا فیری کو کیوں چھوڑا !
بجلی کا قمقمہ روشن ہوا اور سیما کی گود میں فیری ایسے نظر آرہی تھی۔ جیسے گل لالہ کے سینہ میں سیاہ داغ یا چاند کے شفاف چہرہ پہ ابر کا سرمئی ٹکڑا۔ میں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے دونوں تشبیہیں سیما کو سنائیں۔ وہ برہم خاطر

تو پہلے ہی تھی میری اس تشبیہ پر اُسے بہت غصہ آ گیا۔

میں نے بات ٹالنے کی غرض سے سیما کی پسندیدہ کتابوں کا ذکر شروع کر دیا وہ خوش ہو گئی اور فیری کی اندھیری ننھی سی کلائی سے کھیلتے ہوئے مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ عالمِ تصور میں مجھے رخشی کا یاسمین کی کلی جیسا نازک جسم بھینس کے پاس بیٹھا نظر آیا جو اپنی ماں کی یاد میں بیقرار تھی۔

میں نے سیما کو کہا، ایک تم ماں ہو جو چند لمحے کی تنہائی اور تاریکی میں فیری کو پا کر اُداس سی ہو اور ایک وہ ماں ہے جس نے رخشی کو جنگل کی تنہائی اور ماحول کی کثافت میں چھوڑ رکھا ہے۔ ادھر ایک بیٹی ماں کو یاد کر کے سوگوار ہے اور ادھر ایک ماں کو بیٹی کی چند منٹ کی جدائی و تنہائی ناگوار ہے یہ کہہ کر میں نے سیما کی مکمل کی ہوئی تصویر اُٹھائی اور دیکھنے لگا۔ جس میں سیما نے ایک درخت پر بجلی گری ہوئی دکھائی ہے۔ میں نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ سیما آئندہ سال تم یہ تصویر بنا کر نمائش میں پیش کرو۔ فنِ مصوری کی بات سننے کے لئے سیما اپنی نرگسی آنکھوں سے اشتیاق بھرے انداز سے میری طرف دیکھنے لگی!!

میں نے کہا۔ تصویر میں تم ایک اندھیرا کمرہ دکھاؤ جس کے ایک کونے میں مسہری پر ایک سیاہ فام بچہ محوِ خواب ہو اور اس کی گردن سیاہ بلی دبوچ رہی ہو۔"

یہ سُن کر بے ساختگی سے سیما ہنس پڑی ہنستے ہنستے اُس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا اور وہ زرتار دوپٹہ کا آنچل شانوں پر ڈالتے

ہوئے بولی۔

راحیل صاحب! آپ بھول رہے ہیں یہ آپ کی کالی کلوٹی بچی قوم و وطن کی وہ امانت ہے جس کو قدرت نے اولاد کی حیثیت سے ہماری گود میں اس لئے ڈالا ہے کہ ہم اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر کارآمد بنائیں کہ یہ ملک و قوم کے دامن پر سیاہ دھبہ نہ ثابت ہو۔ بلکہ چاند سے بڑھ کر روشن ہو۔ قوم اور وطن کی عظمت کا انحصار بچوں کی سفید صورت پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی عادات، اخلاق، تعلیم و تربیت کی بہتری و برتری پر ملک کی قسمت کا بننا و بگڑنا موقوف ہے۔!!

نیری کے متعلق سیما کی یہ حمایت آمیز تقریر سن کر میں نے سنجیدہ بننے کی کوشش کی اور پھر ایک بزرگ باپ کی طرح نیری کو گود میں اٹھا کر پیار کر کے کہا میری بچی آسمان وطن پر روشن چاند بن کر چمکنے والی ننھی نیری میرے اس شرارت آمیز لہجہ کو محسوس کر کے سیما مسکرائے بغیر نہ رہ سکی!!

میری رخصت ختم ہو گئی تھی۔ سب ملازم معہ سامان کے "گل افروز" روانہ ہو گئے تھے۔ میں سیما، نیری معہ اس کی خادمہ کے کار میں بیٹھ کر گل افروز جا رہے تھے۔ منزل کے قریب پہنچ کر موٹر کا ٹائر پھٹ گیا اور وہ رک گئی!!

خان سرفراز خان کی کوٹھی بالکل سامنے تھی۔ میں نے سیما سے پوچھا کیا یہ مناسب ہے۔ کہ ہم خان صاحب کے ہاں چلیں اور گرم گرم چائے بھی پی لیں۔ سیما فوراً کار سے نیچے اتری۔ شوفر نے اندر جا کر اطلاع دی تو خانصاحب کا ایک قدیمی نوکر ہمارے استقبال کو باہر آیا اور بتایا کہ

خان صاحب معہ بیگم کے آج صبح کسی شادی پر حسن آباد گئے ہیں لیکن ہم خدمت کو حاضر ہیں۔ سیما اور ہیں اندر چلے گئے ایک کمرہ سے سسکیوں کی آواز آئی ہم دونوں ادھر گئے دیکھا ایک عورت بڑی محویت کے ساتھ کچھ سی رہی ہے اور اس کے قریب بیٹھی رخشی رو رہی ہے اور روتے ہوئے کہنے لگی۔ دیکھو نا بی حشمت کتنے اچھے کپڑے پہن کر صبح ہی امی کے ساتھ چلی گئی اب ان کی گاڑی شادی والے گھر پہنچ گئی ہوگی۔ بارات کے ساتھ بینڈ بھی ہوگا اور آتشبازی بھی یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

بی حشمت نے اُسے پیار سے کہا۔ مت رو میری بیٹی میں تم کو دو سر والے دیو کی کہانی سناؤں گی۔ نہیں بی حشمت کہانی مت سناؤ دن کو کہانی نہیں سنا کرتے۔ مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ کہیں امی بھی راستہ نہ بھول جائیں۔ رخشی نے کہا۔ حشمت سرد آہ بھر کر بولی بیٹی تمہاری امی راستہ تو نہیں بھولتیں۔ ہاں تم کو بھول سکتی ہیں۔

سیما نے یہ سن کر کہا۔ راحیل بیگم ضرور رخشی کی سوتیلی ماں ہے جو اس کو آزردہ رکھنے پر آمادہ ہے۔ قدموں کی چاپ سے اور ہماری باتیں سن کر بیک وقت بی حشمت اور رخشی نے ہمیں دیکھا سیما نے رخشی کو گود میں اُٹھایا اور ہم کمرہ طعام میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ سیما کے پوچھنے پر بی حشمت نے بتایا کہ خانصاحب ہفتہ کے بعد واپس آئیں گے۔ یہ سن کر رخشی نے گھبرا کر کہا نہیں امی کل شام کو آجائیں گی!

بی حشمت نے مسکرا کر کہا۔ نہیں حضور صاحبزادی کی دلداری کو وہ

ایا کہہ گئی تھیں۔ آئیں گے تو وہ ہفتے کے بعد ہی!!

اس انکشاف پر رخشی سہم گئی اور افسردہ نگاہوں سے ہم سب کو باری باری دیکھنے لگی۔

سیما احساس ماممتا سے بے چین ہو کر بولی بیگم کو چاہیئے تھا کہ اسے بھی ساتھ لے جاتیں جبکہ ماں کی جدائی اس کو اس درجہ شاق گذر رہی ہے آخر بچی ہے اکیلے کیسے بہل سکے گی۔ میں نے بھی سیما کے اس خیال کی تائید کی اور پوچھا بڑی بی کیا رخشی خان صاحب کی پہلی بیوی سے ہے۔

حشمت نے کہا جی نہیں ناواقف لوگ یہ ہی سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی سوتیلی بیٹی ہے ورنہ بیگم حقیقی ماں ہیں۔!!

سیما رخشی سے بہت پیار کر رہی تھی۔ جب چلنے لگی تو اُس نے فیری کے کھلونوں کی خوبصورت "باسکٹ" اور بسکٹوں کے ڈبے رخشی کے ہاتھ میں دے دئیے۔ جب ہم گولڈن روڈ پہنچے تو فیری کو بخار تھا تمام رات وہ سخت تکلیف میں رہی۔ سیما کے اضطراب نے مجھے بھی بہت پریشان رکھا۔

فیری کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ کئی ہفتے اسی پریشانی میں گذرے جب فیری کو صحت حاصل ہوئی تو اس خوشی میں سیما نے ایک دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں خان سرفراز خان بھی بمعہ بیگم مدعو تھے۔

دعوت میں ان کے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی جو رخشی سے بھی زیادہ

خوبصورت تھی آئی۔ سیما نے مجھے بتایا۔ کہ یہ سرفراز خان کی چھوٹی لڑکی صبوحی ہے۔ میں نے اس کو گود میں لیا وہ بڑی پیاری چلبلی بچی تھی۔ مجھے کائنات جہاں کی ہر حسین چیز سے محبت ہے مجھے حسن اتنا پسند ہے کہ جی چاہتا ہے میرے چاروں طرف حسن بکھرا رہے اور میں اس کی تجلیوں میں سراپا حسن بن جاؤں یہ بالکل سچ ہے کہ اگر "سیما" اس قدر حسین نہ ہوتی تو میں اُس سے یہ محبت نہ کرتا اور اگر مجھے سیما کی ناراضگی کا خوف نہ ہوتا تو میں سیاہ فام فیری کو اس دریا میں ڈال آتا جہاں بہت سی مچھلیاں ہوتیں اور کوئی ایک بڑی مچھلی فیری کو سیاہ مینڈک سمجھ کر نگل جاتی۔

میں صبوحی کو لے کر باہر شامیانہ میں آیا اور خان صاحب سرفراز خان کو رخشی کے متعلق بتایا کہ وہ زرنگار میں ہم نے رخشی کو دیکھا تھا۔ لیکن بیگم نے اس ذکر کو ٹال دیا اور صبوحی کی معصومانہ اداؤں کا دلچسپ موضوع درمیان میں لے آئی!!

کچھ عرصہ بعد خان صاحب سرفراز خان تبدیل ہو کر جہانگیر آباد چلے گئے اور میں مستقل طور "کہکشاں آباد" میں مقیم ہو گیا اور فیری ڈاکٹری کی ڈگری لینے انگلینڈ چلی گئی تھی۔ وہاں سے واپس آ کر وہ ایک بڑے ہسپتال میں مقرر ہوئی۔ جس وقت وہ دکھیا مریضوں کے درمیان کھڑی ہو کر اپنی توجہ اور تندہی سے اُن کی خدمت اور علاج کرتی اور مریضوں کے زرد مایوس، پر ارمان چہروں پر شکریہ کا رنگ ظاہر ہوتا تو مجھے فیری پر ایک ملکوتی شان چھائی نظر آتی اُس نے

بیمار، لاچار غریبوں کو آرام پہنچانے کی خاطر اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا۔ وہ دن رات اپنی سر توڑ کوششوں اور تجربوں سے اُن کے علاج و خدمت میں مصروف و منہمک رہتی۔!!

ایک دن فیری کافی رات گئے ہسپتال سے واپس آئی اور سخت نڈھال ہو کر صوفہ پہ لیٹ گئی۔ تمام دن کی مصروفیت نے اُسے بہت تھکا دیا تھا۔

صبح ہونے پہ فیری ہسپتال نہ گئی اور کوٹھی کی پچھلی طرف ہلکی دھوپ میں دراز تھی۔ میں اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ نوکر نے بتایا ایک خاتون آئی ہیں جو ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو فیری نے اُٹھنے سے گریز کیا۔ لیکن پھر انسانی ہمدردی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر چلی گئی میں بھی ڈرائنگ روم میں گیا۔ ایک کمزور و ناتوان عورت فیری کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور التجا کی کہ میں بہت دور سے آئی ہوں میری بچی دن بدن کمزور ہو رہی ہے کئی علاج کرائے مگر یہ تندرست نہیں ہو رہی۔ اس کے ہم عمر جو بچے تھے وہ سب کافی بڑے اور خوب سرخ و سپید ہیں لیکن یہ اپنی عمر سے کم نظر آرہی ہے۔

بچی کو دیکھتے ہوئے فیری کا ہاتھ اُس خاتون کے ہاتھ سے لگا تو فیری نے ہمدردی سے پوچھا کیا آپ کو بھی بخار ہے؟

جی ہاں! مگر یہ ہفتہ آپ اس کا علاج کریں جب یہ ٹھیک ہو جائے گی تو پھر اپنا علاج کراؤں گی۔ کیونکہ میری مالی حالت بیک

وقت دو علاج نہیں کرا سکتی خاتون نے کہا۔!!

فیری نے بچی کو چند دوائیاں دیں اور پھر وہ چلی گئی!

بچاری ماں اپنی یہ حالت۔ لیکن پرواہ نہیں اور بچی کی کمزوری کے احساس سے فکرمند ہے کہ اپنے آپ پر بچی کی صحت کو ترجیح دیتی ہے۔ فیری نے ہمدردی سے کہا۔

فیری کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم آج اُس کے مکان پر چلیں اور تم فی سبیل اللہ اس کا علاج کر کے ایک داغدار جوانی کو موت کے منہ سے بچا لو۔ میں نے متاثر ہو کر کہا۔

ایک تھکی ہوئی انگڑائی لے کر فیری کہنے لگی۔ آج میں کہیں بھی نہیں جا سکتی اور پھر چمکیلی دھوپ میں لیٹ گئی۔!

میں سوچنے لگا یہ ہے کون ؟ مگر حافظے پر کوئی نقش نہ اُبھرا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ مگر فیری نہ جا سکی۔ ایک دن میں مطالعہ روم میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کہ فیری نے آ کر کہا۔ ابی میں اُس مریضہ کو جو اپنی بچی لے کر یہاں آئی تھی دیکھنے جا رہی ہوں آپ بھی میرے ہمراہ چلیں۔

میری نگاہوں میں فیری کا مرتبہ ایک بے لوث ہمدردی کے طفیل بہت بلند ہو گیا۔ میں نے شفقت، مسرت، عقیدت کے ملے جلے تاثرات سے فیری کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

فیری قوم و ملک کو تم جیسی پاک طینت، فرشتہ خصلت

بیٹیوں کی بڑی ضرورت ہے۔ جن کی ذات سے وطن، ملک اور قوم کی عظمت کا انحصار ہے۔ واقعی فیری تم سیما کے کہنے کے مطابق سیاہ دھبہ نہیں بلکہ چاند سے بڑھ کر روشن ہو۔ میرے سامنے فیری خاموش کھڑی تھی اور اس کی سفید باریک ریشمی ساری فرشتوں کے مقدس پروں کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔

ہماری موٹر شہر سے دور افتادہ حصے میں ایک مسمار شدہ مکان کے آگے کھڑی ہو گئی۔ موٹر سے نکل کر بدبودار کیچڑ کی گلی سے ہو کر ہم مکان کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دستک دی تو ایک پھٹی ہوئی چادر میں سمٹی سمٹائی وہی عورت ہمارے استقبال کو آئی۔ جو اُس دن اپنی بچی کو لے کر فیری کو دکھانے آئی تھی۔

اس کا چہرہ اس دن گیندے کے پھول کی طرح زرد تھا مگر اب اور زیادہ زعفرانی سرخی اختیار کئے ہوئے تھا اس کی آنکھوں میں سوکھے ہوئے آنسوؤں کی بے چارگی چمک رہی تھی۔ خاتون نے ہمیں عزت کے ساتھ ایک کمرہ میں بٹھایا۔ جہاں مفلسی کی جھلکیوں کے ساتھ اس کا سلیقہ عیاں تھا۔ ہم بیٹھ گئے۔!

اُس نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔ ڈاکٹر صاحبہ! ننھی کی دوائی کا بل میں نے پرسوں آ کر دینا تھا۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔

میں کمزور بچی کی بیمار ماں کو دیکھنے آئی ہوں۔ فیری نے مسکرا کر کہا۔!

اتنے میں ایک نوجوان معہ ایک معتبر برقعہ پوش عورت کے صحن میں آیا اور مریضہ خاتون سے کوئی بات کی۔ جس کو سن کر مریضہ نے ایک بیگ نوکر کے ہاتھ میں دیا اور وہ لے کر چلے گئے۔

مریضہ جب اندر آئی تو میں نے دیکھا۔ اس کی خشک آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں اور خون دل کے ان قطروں کو جو آنکھوں کے راستہ سے آنسو بن کر ابل رہے تھے۔ وہ ہم سے پوشیدہ رکھنے کی خاطر دوپٹہ سے خشک کر رہی تھی۔

خالی گھر میں مجھے ایک شکستہ میز پر ایک گروپ تصویر نظر آئی میں اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ جس میں خان سرفراز خان بھی تھے۔ میں نے خانصاحب کی تصویر پہ انگلی رکھ کر پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ میرے ابا جان!!

آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

میرا نام ہے "رخشی"۔ مریضہ نے جواب دیا۔

تو آپ رخشی ہیں۔ سرفراز خان کی بڑی صاحبزادی۔

جی ہاں! آپ کیا جانتے ہیں ابا محترم کو۔ رخشی نے تعجب سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے جواب میں وہ سب کچھ بتا دیا۔ جو تعلقات مجھے سرفراز خان سے تھے۔ فرطِ خوشی اور حیرت سے رخشی مجھے اور فیری کو دیکھ رہی تھی!!!

میں نے رخشی سے پوچھا۔ بیٹی یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تم نے شادی کرنے میں والدین کی خلاف مرضی کوئی لغزش تو نہیں کی؟ تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اور وہ کون ہے؟

رخشی کے چہرے پہ بوجھ سے دبی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولی۔ آپ نے ایک دم اتنے سوالات کر دئے اب میں کس ترتیب سے کس کس کا جواب دوں۔ پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگی۔

والدین زندہ سلامت ہیں جنہوں نے حسب نسب کی قربان گاہ پہ مجھے بے دریغ قتل کر کے ایک عالم بے عمل کے سپرد میری زندہ لاش کر دی۔ جو ملکی رہنماؤں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ اپنی آواز بھی بلند سے بلند کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے زندگی کے کئی نادر موقعے گنوا چکا ہے اور جب ملک بھر میں حکومت کی تبدیلیوں کے ساتھ ہر شعبہ حیات میں ایک جدید یہ تغیر انگڑائی لیتا نظر آتا تو وہ میرا جیون ساتھی لکیر کا فقیر بنا بیکار باتوں میں وقت صرف کر کے مجھے زندگی کے اس موڑ پہ لے آیا جہاں سے چھٹکارا پانے کے لئے سوائے موت کے اب اور کوئی راستہ نہیں۔ یہ عورت جو ابھی بیگ لینے آئی تھی میری حقیقی ماں ہے اور وہ نوجوان میرا بھائی آصف تھا۔!

ڈاکٹر میرے جس بخار کو آپ اس قدر محسوس کر رہی ہیں اس بیماری کی خبر کتنے عرصہ سے میں اپنے عزیزوں کو دے رہی کہ ان کی

ہمدردی کی طالب تھی!

لیکن میری محسن یہ ساری دنیا خود غرض، درندوں کا ایک خوفناک جنگل ہے یہاں زندہ رہنے کا حق اُسی کو ہے جو دوسروں کے گلوں پر اپنے جبڑوں کے تیز دانتوں کو پیوست کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے شادی کرنے میں والدین کے خلاف مرضی کوئی لغزش کی؟ نہیں میں نے خاندان کی ناک کو اونچا رکھنے کی خاطر حد سے زیادہ شرافت کی یہی میرا جرم ہے اور اسی جرم کے تحت میں موت کے دروازہ پر کھڑی کی گئی ہوں۔ جہاں سے مجھے ہٹایا اس لئے نہیں جاتا کہ میری موت سے میرے عزیزوں کی بہت سی الجھنوں سے نجات ہے وہ میری موت کے طالب ہیں مگر میں اپنی بچی کی خاطر مرنا نہیں چاہتی۔ میں موت کو دور دھکیل کر زندہ رہوں گی اور زندگی کو اپنا کر اپنی ننھی سی بچی کے مستقبل کو شاندار بنا کر اپنے مقدر کی تاریکی کو منور کر دوں گی۔

فیری نے محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا تم اپنا عزم مستقل قائم رکھو اور اپنا علاج باقاعدگی سے کراؤ۔ میں صبح آ کر تمہیں ہسپتال لے چلوں گی۔

نہیں ڈاکٹر مجھے علاج کی ضرورت نہیں۔ میں اب کسی انسان کے احسان کی متحمل نہیں ہو سکتی میں نے بہت فریاد کی۔ بہت کچھ آہ و زاری کی مگر دنیا نے میری ہر فریاد کے بدلے ایک زبردست ٹھوکر عطا کی۔ میں نے اپنی ہر شکست پر فتح کا یقین کیا۔ مگر جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں ہوں اور میرے سارے خواب مرجھائے پھولوں پر سے شبنم کے قطروں کی طرح اُڑ گئے تھے

ڈاکٹر آپ چاہتی ہیں کہ میں پھر آنکھیں بند کر لوں۔ سو جاؤں اور پھر وہی خواب دیکھنے لگ جاؤں۔ یہ اب مجھ سے نہ ہوگا۔ میری ننھی جو چند دنوں کی مہمان ہے اور وہ سامنے بخار میں بے ہوش چارپائی پر رکھی ہے اگر زندہ نہ رہ سکی تو میں وہ بات کروں گی جو میں نے سوچ رکھی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یوں سسک سسک کر مرنا انسانیت کی توہین ہے۔ شاید سماج کے قانون دان نہیں جانتے کہ زندگی کی گہرائیوں میں چپکے چپکے بہنے والی خشک ندی جسے دنیا عورت کہتی ہے۔ اپنے اندر سمندر بن جانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے!!

نیری نے اُسے تاکید کی۔ کہ صبح تیار رہنا میں تم کو اور بچی کو لے جا کر اپنے ہسپتال میں داخل کراؤں گی!!

میں اور نیری "پام ولا" واپس آگئے۔ ہسپتال میں کام بڑھ جانے کی وجہ سے نیری دو دن تک نہ جا سکی۔ ایک دن میں نے خود ادھر کا رُخ کیا جہاں رخشی رہتی تھی۔ جب میں وہاں گیا تو لوگوں نے بتایا کہ پرسوں رخشی کی لڑکی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور پھر رات کے وقت ادھر سے گذرتے ہوئے لوگوں نے اس کھنڈر کی سیاہ ویرانی میں چنگاریاں اُڑتی دیکھی تھیں اور ہلکی ہلکی انسانی کراہ کی خوفناک آوازیں بھی سُنی تھیں میں اندر گیا۔ لیکن مجھے رخشی کی آنکھوں میں وہ خشک آنسو کہیں نظر نہ آئے جو دو اُداس آنکھوں میں ایک لمحہ تڑپنے کے بعد زندگی کے تمام خوابوں کو پیاسا چھوڑ کر ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح چپ چاپ کہیں گر پڑے!!!

ننھے مسافر سے

خوشبو سے اپنی ساری فضا کر گئے لطیف
گو مختصر سی ہوتی ہے پھولوں کی زندگی

حیات اجسام کے اے ننھے مسافر "فردوس" کی یاد نے تجھے یہاں نہ رہنے دیا۔ تم پھولوں میں کھیلتے کھیلتے کسی گہرے شوخ رنگ پھول کی تلاش میں حسین تتلیوں کے تعاقب میں کسی دور کے چمن میں چلے گئے جہاں سے تم واپس نہیں آسکتے۔

تیرے خوبصورت لباس ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں تیرے کھلونوں کا رنگ پھیکا پڑگیا ہے۔ گلستان میں تمام غنچے تمناؤں کے ہزاروں گوہر آبدار لئے ہوئے خواب شیریں سے بیدار ہو رہے ہیں ایسی خوشگوار اور چمکیلی ساعتوں میں تو اکثر شوخ و چنچل بن جانے کا عادی تھا پر اب تمہاری سیاہ چمکیلی آنکھوں کا سکوت کامل کسی گہرے فکر و تردد کا پتہ دے رہا ہے تمہارے معصوم چہرے پر ایک ہلکا تبسم ہے کیا تم کوئی لطیف خواب دیکھ رہے ہو؟ کیا ان مصائب اور مفارقت لامتناہی میں تم اپنی خالہ کو پیام تسلی نہیں بھیجو گے جسے تمہاری ستم انگیز جدائی نے نڈھال کر دیا ہے قیامت کیلئے بھی ایک ساعت مقرر ہے مگر فرشتوں نے تم کو بے جان کر کے قیامت سے پہلے قیامت ڈھا دی۔ اے ننھے مسافر! اب میرا دل بھی چاہتا ہے کہ میں اس زندگی کے بوجھ کو اُتار پھینکوں اور اس بلند ترین چمکیلی بستی میں چلی آؤں جہاں تم سے پہلے دو مقدس روحیں جا چکی ہیں جنہوں نے اپنے بعد میری مسرتوں آرزوؤں کو فنا کر دیا ہے

وہ رفتگان خاک کہ جن کی تمام عمر
خالی محبتوں سے کوئی بات ہی نہ تھی

گلچین

میں یہ افسانہ اپنے بھانجے ہمایوں فر کے نام معنون کرتی ہوں۔ جو ۲۴ دسمبر بروز جمعہ ۱۹۵۴ء کو اپنے صحن گلستاں میں کھیلتے اچانک لقمہ اجل ہو گیا!!!

آج صبح سے تمہاری بھاوج کی حالت بہت خطرناک ہے۔ پہلی ٹرین سے فوراً آ پہنچو!

شاہدہ کے ہاتھ سے تار فرش پر گر پڑا۔ اور آنسوؤں کی مسلسل لڑیاں اس کے رخساروں پر بہنے لگیں۔ انجم ایک معصومانہ انداز سے ماں کے چہرہ کو دیکھنے لگا۔ اور پھر گھبراہٹ کے عالم میں کہا اچھی امی روتی کیوں ہو؟

انجم بیٹا دعا کرو تمہاری معصوم دعائیں بابِ اجابت کو پہنچیں گی۔ اپنی شفیق ممانی کی صحت یابی کے لئے بارگاہِ حقیقی میں اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر التجائیں کرو۔ آہ پیاری نغمی شفقتِ مادری سے محروم ہو جائے گی۔

اُف! بھابی کی آرزوؤں کا انتہائی بے دردی کے ساتھ خون ہو گا۔ افسوس انجم اور نغمی کے متعلق کیسی کیسی تمنائیں تھیں۔ اُن کے دل میں شاہدہ افکار و الم کے بوجھ سے دبی ہوئی حسرتناک لہجے میں یہ تمام باتیں زبانِ حال

سے کہہ رہی تھی !!

اُس نے چشمِ پُرنم آنکھوں سے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ گاڑی کے آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ بہت جلد تیار ہوکر کار میں بیٹھ گئی اور اسٹیشن پر پہنچی۔

(۲)

وہ صبح ننھی نغمی کے لئے کس قدر تباہ کن ثابت ہوئی جبکہ ظالم موت اُس کی پیاری ماں کو ہمیشہ کے لئے چھین کر لے گئی تھی! گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

جوانامرگ زوبی کے لئے اپنے پرائے سب ہی رو رہے تھے۔ نغمی کا امی کہہ کر تلملانا دیکھنے والوں کو خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔!

آہ قدرت نے نازوں کی پالی نغمی کو ماں کی گود میں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا تھا۔ شاہدہ کی حالت ابتر تھی۔ اپنی اکلوتی بھتیجی کا عالمِ بے کسی میں رہ جانا اپنے بھائی کا گلشنِ امید تاراج ہوتے دیکھنا کس قدر روح فرسا منظر تھا۔

نوحہ غم ہو یا نغمہ شادی دونوں عارضی ہیں۔ رنج کے بعد خوشی، خوشی کے بعد رنج، زیست کے بعد موت روشنی کے بعد تاریکی لازمی ہے تقاضائے فطرت ہے وہ دل جو مسرت و شادمانی سے لطف اندوز وہ قلب جو مسرت کے روح پرور خیالات کا گنجینہ تھا۔ پریشانی والم انگیز خیالات نے پژمردہ کر دئیے۔

تفکرات کے ہجوم نے اس کے پھول سے چہرے کو کملا دیا تھا۔ نعمی کا خیال اسے کسی پہلو آرام نہ لینے دیتا۔ وہ سوچتی تھی کہ یہ نوشگفتہ کلی کیونکر پروان چڑھے گی۔

(۳)

شاہدہ کو مرحومہ زوبی سے بے حد محبت تھی۔ انجم شاہدہ کا اکلوتا لخت جگر تھا اور نعمی زوبی کی نور نظر تھی۔ جب کبھی زوبی انجم کو پیار کرتی تو شاہدہ مسکرا کر کہہ دیتی تھی کہ بھابی جان آیئے ہم ان کھلونوں کو آپس میں بدل لیں۔

وقت شدید سے شدید غم واندوہ کے نقوش مدھم کرتا رہتا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ غمزدہ دل خود ہی سکون پذیر ہو جاتے ہیں۔ چند مہینوں کے بعد سوائے نعمی کے زوبی کو قریب قریب سب ہی بھول چکے تھے۔ نعمی کبھی کبھی اپنی توتلی زبان سے ایسا ذکر کرتی۔ گویا اس نے محبت مادری کا کوئی رنگین خواب دیکھا تھا۔ آہ! ناسمجھ بچی۔ چونکہ مرنے والی کی وصیت تھی۔ اور شاہدہ کی بھی دلی تمنا۔ اس لئے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے وہ نعمی کو اپنے ساتھ لے آئی۔ لکھ پتی باپ کی بیٹی، مہربان پھوپھی کی بھتیجی جس قدر بھی نازونعم میں پلتی کم تھا۔ شاہدہ کی دنیائے اُمید کے دونوں پھول تھے۔ جنہیں یہ پل بھر کے لئے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔

نعمی کے والد حج بیت اللہ کو روانہ ہو گئے تھے اور وہ اپنی

تمام جائداد کوٹھیاں، دوکانات، بنک میں جمع شدہ روپیہ نغمی کے نام وقف کر کے خود گوشہ نشین ہو گئے۔

(۴)

اب نغمی کی عمر پانچ سال کی تھی۔ انجم کو اس کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ دونوں باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ نغمی بلا کی ذہین اور شوخ طبع تھی اور اس کے برعکس انجم بے حد متین اور سنجیدہ مزاج تھا۔

وہ کبھی نغمی سے نہیں لڑتا تھا۔ حالانکہ یہ روز نت نئی شرارتوں سے انجم کو تنگ کرتی۔ مارچ کی سحر کار صبح تھی۔ نغمی اپنی گڑیا کو لے کر باغ میں گئی اور تتلی کی طرح اچھلتی ہوئی یاسمین کے پھولوں میں چھپ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی راج دلاری سبزہ گل بوقلموں کو تسخیر کر رہی ہے۔ ندی کے شفاف پانی سے اپنا دامن بھرتی اور پھر اس معصومانہ محویت سے قوس و قزح کو دیکھ کر اچھلنے لگتی۔ کبھی تتلی کی مخملی پرواز کا تعاقب شروع کر دیتی اور خود فراموشی کا بہترین نقشہ نظر آتی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی ان حسین کیاریوں کی طرف جانے لگی جو انجم نے نہایت شوق سے اپنے ہاتھوں لگائے تھے۔

شرارت آمیز نگاہوں سے آس پاس دیکھنے لگی۔ کہ کہیں انجم مجھے وہاں جانے سے روک نہ دے۔ آناً فاناً نغمی پھولوں میں روپوش ہو گئی۔ کبھی کبھی آفتاب کی ضیا پاش کرنوں میں اس کے سنہرے کٹے

ہوئے بال شانوں پر بکھرے چمکتے نظر آتے ۔۔۔! پھولوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر اُس نے اپنا دامن پھیلایا اور شبنم سے دُھلے ہوئے پھول ایک ایک کر کے اپنی جھولی میں جمع کرنے لگی اور پھر ایک شاعرانہ استغراق سے اپنی گڑیا کے پاس زمین پر بکھیر دیتی۔ چمن کی چہکتی ہوئی چڑیا اپنے رنگین پر پھیلا کر رنگین نغموں سے اس کے بھولے پن کی داد دیتی۔ نسیم کے لطیف جھونکے نکہت گل سے اس معصومانہ رنگینی کا حال سُن کر اس کے رخساروں کے بوسے لیتے۔ اسی اثنا میں انجم اپنے پھولوں کی بہار دیکھنے باغ میں آیا۔ اُف اس کا پیارا چمن اُداس اور سُنسان تھا۔ باغیچہ پہ ایک خزاں رسیدہ ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ تمام پھول پنکھڑیوں کی صورت میں منتشر تھے۔ حسین پھولوں کی "معصوم گلچین" گلاب کی جھاڑیوں میں چھپی کھڑی تھی۔ انجم اشکبار آنکھوں سے خاک آلودہ پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ نغمی کے بے رحم ہاتھوں کو کاٹ کھائے کہ نغمی چیختی چلاتی شاہدہ کی گود میں جا کر چھپ گئی۔ ہائے پھوپھی جان انجم بھائی مارتے ہیں ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اُس نے کہا!

شاہدہ نے بے تابی کے عالم میں نغمی کو گود میں لے کر سینہ سے چمٹا لیا اور اس کے حسین سرخ تمتماتے ہوئے رخساروں پر بوسۂ محبت ثبت کر کے باغ میں گئی۔

انجم پژمردہ پھولوں کے پاس بیٹھا رو رہا تھا۔ شاہدہ نے نغمی کو محبت آمیز لہجے سے کہا تم شرارتوں سے باز نہیں آتیں یاد رکھو ہم تم سے

روٹھ کر اللہ میاں کے پاس چلی جاؤں گی۔ اب اگر تم نے پھولوں کو توڑا۔ ظالم گلچین تو باز کیوں نہیں آتی۔

نغمی سہم گئی اس نے رو کر کہا۔ اچھی پھوپھی جان میں نے پھول نہیں توڑے!! انجم بھائی جھوٹ کہتے ہیں اب میں کبھی بھائی کے پھولوں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ فرطِ محبت سے شاہدہ نے نغمی کا منہ چوم لیا اور کہا آؤ انجم اب ننھی بہن سے صلح کر لو۔ دیکھو کتنی پیاری ہے تمہاری بہن!!

(۵)

شام کا وقت تھا آسمان پر بادل جا بجا تیر رہے تھے۔ شاہدہ دونوں بچوں کو آیا کے سپرد کر کے مسز عشرت کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

انجم کمرے میں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق تھا۔ نغمی پلنگ پر لیٹی اپنی گڑیا کے سنوارنے میں محو تھی۔ قریب ہی آیا بیٹھی جرابیں رفو کر رہی تھی۔ برقی روشنی سے تمام کمرہ بقعۂ نور بنا تھا۔ یکایک نغمی کے دل میں پھول توڑنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور وہ چپکے سے باغ میں نکل گئی۔ پھولوں سے عریاں ٹہنیاں سرد ہوا سے اپنی ننھی گلچین کی داستان بیان کر کے ٹھٹھری کھڑی تھیں۔

غروب آفتاب کی گلکاریوں سے فضائے مغرب میں ایک مسرت زا سرخی کی نمود تھی۔ نغمی نے چھڑی سے پھولوں کو جھاڑنا شروع کیا عین اسی وقت ایک رنگین تتلی پھولوں کے بیچ سے نکل کر بھاگی۔ نغمی نے چھڑی

ہاتھ سے پھینک دی۔ اور تتلی کے پیچھے دوڑی۔ کئی تتلیاں پھولوں پر جمع ہوئیں آپس میں گفت و شنید کرتیں اور پھر کپکپاتی نورانی فضا میں غائب ہو جاتیں۔ نعمی ان کو پکڑنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہزار جتن کئے لیکن جوں ہی اس کی نازک انگلیاں ٹہنی سے مس ہوتیں۔ تتلیاں پھر سے اڑ جاتیں تنگ آ کر نعمی نے تتلیوں سے انتقام لینے کی یہ صورت نکالی کہ تمام پھولوں کو توڑ کر ایک انبار لگا دیا۔ نعمی نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ اس نے دیکھا انجم غضب آلود نگاہوں سے گھورتا بھاگا آ رہا ہے۔ نعمی نے آگے بھاگنا شروع کیا۔ پیچ در پیچ روشوں سے ہوتی ہوئی ایک ایسی جگہ پہنچی۔ جہاں وہ انجم کی وسعت نظر سے پوشیدہ ہو گئی تھی۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ تھوڑی دیر ٹھہر گئی اور سوچا اب تو پھوپھی جان آ گئی ہوں گی۔ اور مجھے انجم بھیا کی مار سے بچا لیں گی۔ بھلا وہ پھر کیسے ماریں گے، پھر دل ہی دل میں کہنے لگی نہیں نہیں نہیں وہ سب پھول انہیں دکھا دیں گے اور پھوپھی جان امی کی طرح مجھ سے رُوٹھ جائیں گی اس خیال کا آنا تھا کہ وہ بے تحاشا رونے لگی۔ اور سرخ پھول کو شرمانے والے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرات موتیوں کی سی درخشانی دکھا رہے تھے۔

فضائے عالم پر ایک وحشتناک منظر طاری ہو گیا۔ رات کا وقت تھا مغرب کی جانب سے سیاہ بادل اُٹھے اور اُمنڈ اُمنڈ کر چھا گئے ہوا کے جھونکے اور زیادہ تیزی سے سیٹیاں بجانے لگے اور یہ شور بڑھتا

گیا۔ ڈراؤنے بادل فیل مست کی طرح جھوم جھوم کر بھرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج ان کی گردش کو روکنے والا کوئی نہیں۔ نغمی نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور گھر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی لیکن رات کی تاریکی میں وہ راستہ بھول چکی تھی۔ اس بھیانک منظر میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

دور سے ایک موٹر برقی قمقموں سے جگمگاتی پانی میں تیرتی تیزی سے آتی دکھائی دی۔ نغمی سامنے کی پہاڑی کو طے کر کے دوڑتی ہوئی سڑک کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے دل میں یہ امید ایک مسرت انگیز خیال سے پیدا ہوئی۔ کہ ضرور پھوپھی جان اس کار میں آ رہی ہوں گی تب تو میں انجم بھائی سے پہلے سب باتیں کہہ دونگی نغمی اور موٹر میں کوئی بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ موٹر ایک دھماکے کی آواز سے جہاں تھی کھڑی ہو گئی اور یہ خوفزدہ ہو کر رونے لگی۔ شوفر نیا ٹائر لگانے کو نیچے اُترا۔ دیکھا ایک معصوم ہستی بے یار و مددگار اس طوفانی رات میں عالم بے بسی میں کھڑی رو رہی ہے۔ شوفر نے اُسے اُٹھایا اور پوچھا تم کہاں جاؤ گی؟ یہاں کیسے آئیں؟ مجھے انجم بھیا مارتے ہیں میں نے ان کے پھول نہیں توڑے۔ نغمی نے کہا!!

شوفر نے پوچھا تمہاری ماں کہاں ہے؟ اللہ میاں کے پاس اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی سردی کے باعث دانت بج رہے تھے اس کو غش سا آ گیا!!

یہ کار پشاور سے آرہی تھی۔ اس میں ایک معزز خاتون سفر کر رہی تھیں۔

خاتون نے نغمی کو کمبل میں لپیٹ کر گود میں لے لیا اور رقت آمیز لہجہ سے کہا۔ شوفر یہ لڑکی سوتیلی ماں کے مظالم کا شکار بنی ہے میں اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی اب جدا نہیں کر سکتی منزل پر جلد پہنچنے کی کوشش کرو۔!!!

(۷)

انجم نغمی کے تعاقب میں کافی دور آیا۔ مگر اس کو نہ پا سکا۔ بارش موسلا دھار برسنے لگی۔ تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ وہ ناکام لوٹ آیا۔ رات کے گیارہ بجے شاہدہ گھر آئی دیکھا انجم پلنگ پر لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں سانس مشکل سے چل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں جل رہے تھے شاہدہ سناٹے کے عالم میں آگئی میرے اللہ یہ کیا؟

گھبرا کر آیا کو آواز دی۔ وہ دوسرے کمرے سے آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔ شاہدہ نے غصہ سے کہا نامراد یہ کیا حالت ہے؟ نغمی کہاں ہے؟ وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

بے... بے بیگم صاحبہ میں نے دونوں کو سلا دیا تھا میرے سر میں درد ہونے لگا اور میں تھوڑی دیر کے لئے دوسرے کمرہ

میں جا کر لیٹ گئی۔

عین اُسی وقت انجم نے بخار سے جلتی ہوئی شعلہ رو آنکھیں کھولیں اور رکتے رکتے سب داستان دہرائی۔ شاہدہ کا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے سیلاب اشک بہنے لگا۔ تمام کوٹھی میں ایک کہرام مچ گیا۔ فون پہ پولیس کو اطلاع دی۔ چپہ چپہ اور کونہ کونہ چھان مارا لیکن نغمی کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ دنوں نے ہفتے ہفتوں نے مہینوں اور مہینوں نے سالوں کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن انجم نغمی کے رنگین تخیل اور اس کی لطیف یاد کو فراموش نہ کر سکا۔ وہ شاہدہ جس پر شباب کی رنگینیوں نے اپنا مکمل اثر نہ دکھایا تھا۔ نغمی کے زندہ چھن جانے سے ایک کہن سالہ عورت نظر آتی تھی۔ اس کی کمر خم تھی اور سر کے بال سفید ——— !!

انجم نے بی اے

(۷)

انجم نے بی اے کی ڈگری حاصل کی اس کی اس کامیابی پر خاندان کا ہر فرد و بشر نازاں تھا۔ انجم کے والد نواب ممتاز علی خان کے جتنے احباب تھے سب نے مبارکباد دی اور مقامی دوستوں نے دعوت مانگی۔ چنانچہ ایک شاندار دعوت احباب واعزا کو دی گئی اور سارے شہر میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ نواب صاحب نے انجم کو انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دوست و احباب سے مشورہ

کر کے اپریل کے آخری ہفتہ میں انجم کی روانگی یورپ قرار پائی۔ موسم کی بہار آخری مارچ کی خنک رات اور پھر کنج باغ رات کے نو بجے تھے چھوٹی چھوٹی منہ بند کلیاں ہوا کے لطیف اور سرد جھونکوں سے لطف اندوز ہو کر جھوم رہی تھیں رات کی رانی کی مست کر دینے والی خوشبو ہوا کو معطر کر رہی تھی۔ انجم بینچ پر باغ میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا دل اس وقت کے نظارے سے بے حد متأثر ہوا۔ گمشدہ نغمی کا ایک مدھم تصور اُس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ نغمی کا خیال آنے پر انجم کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شاہدہ اپنے اکلوتے بیٹے انجم کی جدائی کے خیال سے بے تاب ہو رہی تھی لیکن اُس نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔ اگلے دن صبح کی گاڑی سے انجم کراچی روانہ ہونے والا تھا۔ بہت جلد سب تیاریاں کی گئیں۔ نواب صاحب کا خیال تھا۔ کہ انجم ہوائی جہاز کے ذریعہ انگلینڈ جائے۔ مگر اُسے بحری سفر پسند تھا پاسپورٹ بنوایا گیا۔ کپڑے سلے اور سب کام مکمل ہو گئے۔ آخر وہ دن آیا جب انجم کراچی کو روانہ ہوا۔ نواب صاحب اور انجم کے چند دوست کراچی تک ساتھ گئے۔ ۲۲ اپریل کی صبح کو یورپ جانے والے جہاز نے ساحل کراچی سے لنگر اُٹھا دیا اور سب نے اُسے الوداع کیا ۔

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و بازآئی

(۸)

نوشابہ مشہور تاجر ہرمزجی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں باپ اور دونوں کی راحتیں اُس سے وابستہ تھیں۔ نوشابہ کا سر درد گھر میں قیامت برپا کر دیتا تھا۔ خدا نے اسے ظاہری خوبیوں کے ساتھ معنوی خوبیاں بھی عطا کر رکھی تھیں۔ خوش جمال، خوش گلو اور سلیقہ شعار تھی۔ اس کی رعنائی گل و یاسمین کو شرماتی تھی۔ سرو سا قد، سیاہ ابریشمی بال جملہ اعضا متناسب گھنی گھنی سیاہ پلکوں کے تلے بڑی بڑی چمکدار مخمور آنکھیں ان سب نے مل جل کر اس کو حسن کی مکمل تصویر بنا رکھا تھا۔ زندگی کی سب عشرتیں اُس کے لئے مہیا تھیں اس نوبہار ناز کو حاصل کرنے کے لئے متعدد پیام ہرمزجی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ لیکن ان کی نگاہ میں کوئی ایسا انتخاب نہ تھا جو ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہمہ صفت موصوف ہو۔

بمبئی میں مالابار ہل پر رج روڈ کے قریب ان کی عالیشان کوٹھی بنی ہوئی تھی۔ ہرمزجی اپنے صحن باغ میں کسی گہری سوچ میں مستغرق ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے اپنی نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور مسز ہرمزجی کو مخاطب کر کے کہا۔

میں اپنے ایک تجارتی سلسلہ میں بذریعہ ہوائی جہاز انگلینڈ جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپس آکر پھر ہم نوشابہ کے فرض سے سبکدوش

ہو جائیں گے۔ اتنے میں ڈرائینگ روم میں گھنٹی بجی اور یہ کسی سے ملنے چلے گئے!!

(۹)

نوشابہ کو حرارت ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت ماں کی گود میں سر رکھے غنودگی کے عالم میں خاموش لیٹی تھی۔ کالے کالے بادل اُمنڈ کر آتے اور چھوٹی چھوٹی بوندوں کا مینہ برسا کر چلے جاتے کبھی پہاڑ سے بادل اُٹھتا اور برس کر ہٹ جاتا۔ اور کبھی پیچھے سے بادلوں کی فوج ہوا کے بگل بجاتی آتی تمام کمروں میں سکوت طاری تھا۔ البتہ کوٹھی کے مردانہ حصہ میں ملازم لوگ اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے نوشابہ نے آنکھیں کھولیں اور انگڑائی لے کر کہا۔

امی جان آج کی ڈاک لے آیئے میں ذرا دیکھ لوں۔ ماں نے چند خطوط اور اخبار لا کر کہا۔ بیٹی تھوڑی دیر آرام کرو۔ رات تمہیں کس قدر تکلیف رہی ٹھہر کر پڑھنا۔

نوشابہ نے بغیر جواب دیئے ایک خط اُٹھایا اور کہا یہ ابا جان کا خط ہے۔ دیکھئے امی! آج پانچ بجے یہاں پہنچیں گے۔ لکھا ہے:۔

جان پدر!

مجھے اپنے ایک دیرینہ دوست کے صاحبزادے مسٹر انجم ضیاء

سے ملاقات کا اتفاق ہوا یہ دو سال سے بغرض تعلیم یورپ میں مقیم تھے۔ اب وہ اپنے وطن مالوف کو روانہ ہوں گے اس لئے ہم دونوں پنجشنبہ کی شام کو جہاز سے پہنچیں گے۔ والدعا

ہرمز

خط پڑھ کر نوشابہ اُٹھ بیٹھی۔ امی جان میں لباس تبدیل کروں چند گھنٹوں کی دیر ہے موٹر لے کر استقبال کے لئے بھی تو جانا ہے۔ نہیں بیٹی ہوا زور سے چل رہی ہے۔ موسم آج معمول سے زیادہ سرد ہے۔ ایسی حالت میں تم باہر نہیں جا سکتیں۔ شوفر چلا جائے گا۔ ماں نے کہا!!

کلاک نے پانچ بجائے نوشابہ پھولدار فیروزی ساری زیب تن کئے ٹہل رہی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے اُس کے نازک جسم کو بیخ بنانے گزر جاتے اُس نے سردی محسوس کی اور کمرہ میں آکر ایک صوفہ پر نیم دراز ہو گئی۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ موٹر کوٹھی کے وسیع احاطہ میں آکر ٹھہری۔

ہرمز جی معہ مسٹر انجم ضیا، کے نیچے اُترے۔ مسز ہرمز جی استقبال کے لئے کھڑی تھیں۔ ہرمز جی سیدھے نوشابہ کے پاس آ گئے۔ مسز ہرمز جی نے مسٹر انجم ضیا سے مصافحہ کیا۔ اور کہا چلیئے۔ مس نوشابہ ہرمز جی کمرہ میں آپ کی منتظر ہیں۔ حیرانی اس قدر فرسودہ

لفظ ہو چکا ہے کہ انجم کے جذبات کو اس سے موسوم کرنا شاید ناکافی ہو۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ مس نوشابہ ہرمز منتظر ہیں؟ یہ لفظ اس کے دل میں ایک طوفان تحیر پیدا کر رہے تھے۔ اس نے کوٹھی کی طرف غور سے دیکھا۔ بیرونی دروازے سے اندر باغ صاف نظر آ رہا تھا اور ایک روش سیدھی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ اب شام ہو چکی تھی مگر پھولوں کے رنگ پہچانے جا سکتے تھے۔ گلاب و نارنج کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی انجم گویا دیوانہ سا ہو گیا وہ خود فراموشی کے عالم میں مسٹر ہرمزجی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دروازے کا پردہ ہٹا۔ انجم کو محسوس ہوا۔ گویا اس کے افق حیات پر ایک ستارے کا طلوع ہو رہا ہے کمرے میں قیمتی قالین بچھے تھے۔ جن کے نقوش و صفوف کا رنگ صوفوں کے رنگ سے متناسب تھا۔ ایک صوفے پر ایک شعاع ماہ جلوہ ریز تھی وہ ایک ماہ وش نازنین تھی جس کے چہرے پر کائنات کی مسرتیں تبسم بن کر کھیل رہی تھیں اس کے بال وہ بال جو شب ہائے ہجر سے زیادہ تاریک تھے برقی روشنی میں چمک رہے تھے۔

انجم کے اندر داخل ہوتے ہی ہرمزجی نے نہایت مختصر الفاظ میں مسٹر "انجم ضیاء" کا تعارف نوشابہ سے کرایا وہ (شیک ہینڈ) کر کے خاموش بیٹھ گئی۔

(۱۰)

انجم ضیاء کو بمبئی میں ہرمزجی کے ہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا

ہرمزجی انجم کو نوشابہ سے بڑھ کر چاہتے تھے وہ دن رات بیوی کے سامنے انجم کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ دونوں میاں بیوی کی دلی تمنا تھی اور شائد بہت مناسب کہ نوشابہ کی زندگی انجم جیسے لائق مجسمہ شرافت انسان سے وابستہ کر دیں۔ انجم کو اپنی پیاری ماں کا خیال ہر پہلو دامنگیر تھا۔ وہ سوچتا کہ امی جان میری آمد کی کس قدر منتظر ہوں گی۔ جہاں تک ممکن ہو مجھے جلد وطن جانا چاہیئے۔ مگر ایک پوشیدہ کشش اُسے بمبئی سے رخصت ہونے سے روک رہی تھی۔

انجم گھنٹوں نوشابہ کے پاس بیٹھ کر ولایت کی دلچسپ باتیں سنایا کرتا اور وہ بھی انتہائی اشتیاق کے ساتھ اس کی باتیں سنتی ہرمزجی دل ہی دل میں نازاں تھے اور چاہتے تھے کہ کاش! میں کس طرح انجم کے خیالات کا اندازہ کر لوں اور اس رشتہ سعید کی تکمیل جلد تر اپنے ہاتھوں کر دوں!!

کیا ہندوستان، پاکستان کی جدید تاریخ کوئی مثال پیش کر سکتی ہے۔ کہ کسی نوجوان نے اس سرزمین حسن میں جا کر اس طرح زاہدانہ طریقے سے دن گذارے ہوں؟

یقیناً نہیں یہ ایک معصوم محبت کی کرشمہ سازی تھی کہ انجم وہاں کے جاذب نظر مناظر کو سرسری نظر سے دیکھتا اور ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا اُس کے دماغ پر بچپن کا دھندلا سا حسین خواب چھایا ہوا تھا۔ اسے ننھی نعمی کی معصوم محبت ستاتی اور وہی اُس کے خیال

پہ مسلط رہتی۔

وہ لندن کی حسین تتلیوں کی سحر نگاہی سے بالکل محفوظ تھا۔ انجم کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ نغمی کو بھول کر نوشابہ کے آفتاب محبت کی درخشانیوں سے مسحور ہو گیا تھا۔ نوشابہ انجم کے خیالات کا جائزہ لے چکی تھی۔ مگر اس کی یہی کوشش تھی کہ انجم میری آنکھوں سے افسانۂ محبت نہ پڑھ سکے!!

یہی وہ لطیف ترین جذبہ ہے جو مشرق اور مغرب میں مابہ الامتیاز ہے۔ بحالیکہ وہ ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ دوشیزہ تھی۔ تاہم وہ آغوش مشرق میں پل کر پروان چڑھی تھی۔ لہٰذا اس کی فطری حیا اس بارے میں ایک لفظ تک اپنی زبان پہ لانا نہ چاہتی تھی۔

موسم بہار کا آغاز تھا۔ انجم باغ میں بیٹھا اپنے محبوب ترین شغل تصویر کشی میں مشغول تھا وہ ایک بے خودی کے عالم میں ان تمام تصویروں کو جو یورپ کے بعض حسین ترین مناظر کا عکس تھے زمین پر بکھیرے بیٹھا تھا۔ دفعتاً انتہائی شوق میں ڈوبی ہوئی سریلی آواز سنائی دی۔ انجم نے پلٹ کر دیکھا نوشابہ سامنے کی روش پر کھڑی تصویروں کو دیکھ رہی تھی ـــــ "واللہ! آپ کو تو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ آپ میری تصویر بھی بنا دیں گے؟"

انجم خاموش تھا اور کیوں خاموش تھا؟ اس لئے کہ یہ ایک امتحان کا وقت تھا۔ فن کے اعتبار سے اس کو اس قدر مہارت حاصل

تھی کہ وہ ہر انسان کا اسکیچ ایک منٹ میں بنا لیتا۔ لیکن نوشابہ کے اس سوال نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ نوشابہ نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا۔ کیا آپ کو میری تصویر بنانے سے گریز ہے؟

انجم نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا تمہاری تصویر بنانے سے گریز؟ نہیں میں یہ سوچ رہا تھا کہ تمہاری تصویر بنائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

نوشابہ کی گردن اس آواز کے ساتھ ہی جھک گئی اور اس پر ایک ایسا حجاب طاری ہو گیا جس کا تحمل اس کی شفقی رنگ کی ساری بھی نہ کر سکتی تھی اُس کے چہرے پر ایک ایسا رنگ چھا گیا جس سے فطری حیاداری کی تخلیق ہوتی تھی۔ دوسرے دن انجم نے علی الصبح اپنے باپ کو مفصل طور خط لکھا اور یہ تاکید کی کہ آپ معہ امی جان یہاں تشریف لائیں ایک ضروری امر کے متعلق فیصلہ کرنا ہے ــــــ خط کے پہنچتے ہی نواب صاحب بمبئی آنے کو تیار ہو گئے۔ انجم کو تار دیا۔ کہ ہم لوگ صبح ۸½ بجے پہنچیں گے۔

گاڑی کے آنے سے کچھ دیر پہلے یہ سب اسٹیشن کو پہنچے۔ انجم مضطربانہ طور ٹہل رہا تھا۔ جوں ہی ٹرین رُکی۔ نواب صاحب ایک گونہ بے اختیاری کے عالم میں پلیٹ فارم پر اُترے اور نثار کو سینہ سے چمٹا لیا۔ اس کے بعد نواب صاحب اور ہرمزجی آپس میں بغلگیر

ہوئے۔ خوش آمدید کی صداؤں سے تمام پلیٹ فارم گونج اُٹھا۔ انجم شاہدہ اور مسز ہرمزجی ایک موٹر میں بیٹھے۔ نوشابہ نے موٹر ڈرائیور کی اور انجم کمرے میں جاکر ماں کا قدم بوس ہوُا۔ اُس نے سینہ سے لگایا اور پچاس اشرفیاں انجم کے اوپر سے نچھاور کیں۔

(۱۱)

صبح کا سہانا وقت سورج کی ترچھی کرنیں سنہری سرخی کے اندر سے گزرتی ہوئی آسمان پر پھیل کر اپنا عکس ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں کوٹھی میں آج غیر معمولی چہل پہل ہے۔ انجم آج کامیاب آرزو تھا۔ نواب صاحب اور شاہدہ نوشابہ کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے نوشابہ کی معصوم اداؤں میں ایک کشش تھی۔ اس کے چہرے میں ایک جذب تھا۔ اُس کی سعادت مند حیادار آنکھوں میں ایک جادو تھا جو دیکھنے والے کے دل میں ایک دائمی نقش بن کر رہ جاتا۔ انجم سے بڑھ کر شاہدہ کی تمنا تھی کہ وہ اپنی گمشدہ نعمی کی جگہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ دونوں میاں بیوی اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار تھے۔

اپریل کی وہ شرمیلی شام جس کے دامن پر بادبہاری کی نکہت اور ماتھے پر ساتویں کے ناتمام چاند کی مسکراہٹ تھی۔ اس دن ہرمزجی کا عالیشان محل بقعہ نور بنا تھا۔ پائیں باغ اور گردونواح چراغاں تھے۔ مہمانوں کی ریل پیل باجوں کی پرشور آوازیں، ناچ، رنگ یہ سب

انجم، اور نوشابہ کی شادی کا پتہ دیتے تھے۔

نوشابہ طاؤس طناز کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی خیالات کے عمیق سمندر میں غرق تھی۔ اس کی تمام سہیلیاں انجم کی طرف سے لائے ہوئے زیورات دیکھنے میں محو تھیں۔ آبنوس اور ہاتھی دانت کے خوشنما ڈبے کھلے ہوئے تھے اور اُن میں فیروزہ نگار، زمرد نگار، نیلم نگار، الماس نگار کے سٹ کوہ نور اور شعلۂ طور کی طرح چمک رہے تھے۔

شام کے چار بجے نوشابہ اپنے شفیق والدین سے جدا ہو کر اس کوٹھی پر آئی جو نواب صاحب نے اس تقریب کی تکمیل کے لئے علیحدہ مخصوص کی ہوئی تھی۔

(۱۴)

بہار کی وہ متوالی مسکراہٹ جو عروس فطرت کی آنکھ میں جلوہ ریز تھی۔ نرگس، گلاب، چمپا، نسترن کے رنگوں کی دلفریب آمیزش صحن گلشن میں ایک پر کیف منظر کی روداد بن رہی تھی۔ نوشابہ کی شادی کو دو ہفتے گذر چکے تھے وہ اس وقت گلاب کے پھولوں کے نزدیک کھڑی ہمہ تن ان کی لطافت اور رنگینی کی دید میں محو تھی۔ انجم اس کے قریب خاموش اور ساکت کسی گہرے خیال میں غرق کھڑا تھا سنگِ مرمر کے سفید چبوترے پر مسز ہر مزجی اور شاہدہ بیٹھی مصروف تکلم تھیں دھوپ کی ہلکی ہلکی زر نگار کرنیں ایک سیمابی کیفیت سے ان پر تڑپ رہی تھیں۔ انجم کو نوشابہ نے مخاطب کر کے کہا یہ دیکھئے نرالی قسم کے پھول

فروری کے آخیر میں میں نے اُن کو خود لگایا تھا۔ یہ مجھے بہت مرغوب ہیں ــــ یہ کہتے ہوئے نوشابہ نے ایک پھول کو جو عالم مستی میں جھوم رہا تھا شاخ سے توڑ لیا ـــــ ایں نوشابہ پھولوں کو نہ توڑو۔ انجم نے ایک حسرت آلود نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

خدا معلوم انجم کے ان لفظوں نے شاہدہ پر کیا اثر کیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اختیار آنکھوں کو رومال سے چھپا لیا۔

نوشابہ اپنی ساس کے پاس چلی گئی اور پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ سر میں درد ہو رہا ہے شاہدہ نے اپنے جسم پر شال لپیٹتے ہوئے کہا۔ نوشابہ اُس کا سر دبانے لگی۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک انگوٹھی پر جا پڑی جو شاہدہ پہنے ہوئے تھی یہ انگوٹھی جس کو انگوٹھی کے بجائے چھلا کہنا چاہیئے سونے چاندی کی نہ تھی بلکہ گوندھے ہوئے سنہری بالوں سے بنی تھی۔

نوشابہ نے اس کو بغور دیکھا اور اس کو چھو کر پوچھا یہ انگوٹھی کیسی ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی بچہ کے بالوں سے بنائی گئی ہو۔ شاہدہ کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر ایک سرخی دوڑ گئی جس کے بعد چہرہ زرد ہو گیا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ یہ ایک دردناک واقعہ کی یادگار ہے۔ اس کی یاد سے اتنا رنج ہوتا ہے کہ میں حتی الوسع اس کا ذکر نہیں کرتی۔

نوشابہ نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ کیا آپ مجھے یہ داستان

نہ سنائیں گی۔ میرے دل میں ایک قسم کی بے چینی ہوگئی ہے۔ شاہدہ اُٹھ بیٹھی اس نے اپنی لمبی آہ سے اسس آتشین غم کا دھواں باہر نکالا اور یوں گویا ہوئی:۔

مجھے وہ غارت گر شام کبھی نہ بھولے گی جبکہ میں نے آخری بار اپنی ننھی بھتیجی نغمی کے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ نغمی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی وہ حسن معصوم ابھی دو سال ہی کی تھی کہ ظالم اور بے رحم موت نے اس کو آغوشِ مادری سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا تھا۔ نغمی کو میں اپنے پاس لے آئی تھی وہ میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھی۔ میں ان دونوں کو آیا کے سپرد کر کے خود ایک دعوت پر گئی تھی میرے جانے کے بعد انجم اس کے پیچھے دوڑا اور وہ معصوم جان خوف دہشت سے کسی نامعلوم سمت کو بھاگ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ بارشس زور سے برسنے لگی تھی انجم گھر لوٹ آیا لیکن آہ! نغمی کا کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کا کیا حشر ہُوا؟

یہ پیاری انگوٹھی ان محبوب بالوں سے بنائی گئی تھی جو کنگھی کے دانتوں میں میری گم گشتہ مسرت کے الجھ کر رہ گئے تھے۔ اتنا کہہ کر شاہدہ کے حلق میں الفاظ اٹک گئے اور روتے روتے اس کو غش آگیا۔ انجم جواب تک خود فراموشی کے عالم میں کبھی اپنے ماحول سے بے خبر بھول کی دیا میں محو کھڑا تھا یکبارگی چونک پڑا۔ تو شاہدہ ہتھیلیاں مسل رہی تھی مسز سہروردی گھبراہٹ کے عالم میں کبھی ایک طرف جاتیں کبھی دوسری

طرف انجم ماں کے قریب آیا سرد پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے اور ہر ممکن کوشش سے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد شاہدہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں کھولیں مسز ہرمزجی نے ایک ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ میں نہیں چاہتی اب اس راز کو سینہ میں رکھوں آپ کی بے تابیوں اور بے قراری نے میرا دل ہلا دیا ہے۔ آہ! یہ میری نوشابہ نہیں بلکہ نوشابہ کے پردے میں آپ کی گمشدہ نغمی ہے۔ میں اپنے وطن پشاور سے سیٹھ صاحب کی سخت بیماری کی خبر سن کر بذریعہ موٹر آرہی تھی۔ رات بڑی تاریک تھی میرا بوڑھا شوفر موٹر خراب ہو جانے کے باعث نیچے اُترا اُس نے دیکھا ایک معصوم لڑکی سڑک کے عین وسط میں کھڑی رو رہی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے اُس نے اپنا نام نغمی ہی بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انجم بھیا کے پھول توڑے ہیں اور وہ مجھے مارتے ہیں میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ اس نعمت بے بہا کو حاصل کر کے ایک دائمی مسرت نصیب ہوئی۔

انجم محسوس کر رہا تھا۔ کہ آج رحمتِ حق جوش میں آئی ہے اور آسمان مسرتوں، شادمانیوں کی بارش کر رہا ہے۔ شاہدہ کی آنکھیں فرطِ مسرت سے زمرد کے موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ ایسا خواب جس کا تصور بھی کبھی اُس کے دماغ میں نہ آیا تھا۔

(۱۳)

نغمی بمبئی سے رخصت ہو کر اپنی سسرال کو جا رہی تھی جہاں سے وہ کئی برس پہلے ایک معصوم کلی کی صورت میں حسرت کا نمونہ بنی اپنی شفیق پھوپھی سے چھن کر گئی تھی۔ موٹر کو انجم ہوا کی مانند اڑائے لئے جا رہا تھا۔ وطن کی پاک سرزمین کا چپہ چپہ انجم کو ایک نورانی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شام کی فضا میں گل، اشجار مستانہ وار جھوم رہے تھے دور تک پھیلی ہوئی سرسوں کی زعفرانی زردی افق مغرب میں سرخی شفق سے ہمکنار ہو کر شعریت نظارا کی داد دے رہی تھی۔

نغمی یہاں کے ہر ذرہ کو نگہ شوق سے ملاحظہ کر رہی تھی تھوڑی دیر بعد موٹر اُسی باغ میں آ کر رُک گئی۔ جہاں سے نغمی کسی زمانے میں انجم سے خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھی۔ آج کی شام بھی کتنی حسین اور پر کیف شام ہے وہی موسم ہے اور وہی شام کا حسین ترین منظر، انجم نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا!

نغمی آسمانی زر نگار ساری میں ملبوس موٹر سے باہر نکلی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے درسِ حیرت دینے کے لئے عروس فطرت ایک تڑپ میں لپٹی کھڑی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھائے کوٹھی کی طرف جا رہی تھی باغ کے مالی اور کوٹھی کے تمام ملازمین ایک ایک کر کے سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سب کے چہروں پر

ایک غیر معمولی انبساط تھا اور نگاہوں میں کسی گمشدہ ہیرے کی دستیابی کی چمک !!

نغمی نے سب کے ساتھ بڑے خلوص اور آزادی سے گفتگو کی۔ ان کی خوشی اور غم کی داستانیں سُنیں۔ کبھی اس خنداں محفل میں بلا کا سناٹا چھا جاتا اور کبھی ہنسی کی لہروں سے کمرے گونج اُٹھتے !!

دوسرے دن علی الصبح "نغمی" بیدار ہوئی۔ تمام فضائے عالم پر ایک نورانی رنگ چھایا تھا وہ ایک بے خودی کے عالم میں دروازہ کھول کر پائیں باغ میں گئی۔ جہاں اس نے بچپن کی شعریت کا درس حاصل کیا تھا۔ آج باغ کے گملوں کی مصفا اور ترتیب وار قطاروں میں ایک نشاط انگیز تر و تازگی تھی روشوں پر صفائی کی سج دھج گلشن میں بہار کی رونق کا مکمل نقشہ پیش کر رہا تھا۔ نغمی باغ کی شفاف روشوں کو پائے نگارین سے پائمال کرتی آہستہ آہستہ یاسمین کے پھولوں کی طرف جانے لگی۔ گلاب کے ایک سرخ و شاداب پھول نے جھک کر اس کے نازک ہاتھوں کو عقیدت و احترام کا بوسہ دیا۔ نغمی کے محبت آمیز ہاتھوں نے اس کو توڑ کر اپنے ابریشمی بالوں میں لگا لیا۔ بہت پھول اکٹھے کئے۔ جب "باسکٹ" بھر گئی۔ تو اُسے یاسمین کے گھنے پیڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ اور خود صاف مرمریں حوض سے وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ ہر شے خالقِ موجودات کی حمد و ثنا میں مصروف اس کی صنعت طرازی کے جان نواز نغمے گا رہی تھی۔

ستارے ایک ایک کر کے آسمان سے رخصت ہونے لگے۔ نسیم سحر کی ہلکی ہلکی پیاری راگنیاں گونج رہی تھیں۔ نغمی نماز سے فارغ ہو کر اپنے شیریں مخصوص لہجے میں گا رہی تھی ؎

جہاں کا ہر ورق زر نگار فانی ہے
یہ زینت چمن روزگار فانی ہے
سحر کا حسن گلوں کا سنگار باقی ہے
خزاں پکار رہی ہے بہار فانی ہے
زمین پہ ہوئیں گے ویران باغ پھولوں کے
بجھیں گے بادِ خزاں سے چراغ پھولوں کے

ایک عالم خود فراموشی سے گا رہی تھی۔ نسیم کے خنک جھونکوں نے اُسے لوریاں دے کر اس پر نیند کا کیف طاری کر دیا۔ اُس نے اپنی سلیٹی رنگ کی زردوزی شال کو لپیٹا اور سبزہ زار پر لیٹ گئی آفتاب عالمتاب اپنی زریں شعاعوں سے کائنات ارضی کو منور کرتا ہوا مشرق کے طلائی سمندر سے تیرتا ہوا باہر نکلا۔

انجم بیدار ہوا۔ تو اُس نے دور سے دیکھا نغمی پھولوں کے پاس سو رہی ہے۔ وہ کیمرہ لے کر باغ میں آیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نغمی کی صبیح پیشانی پہ رقص کر رہے تھے۔

انجم نے دل ہی دل میں کہا کتنا خوبصورت بہت ہی حسین منظر ہے مگر سونے والی کو کیا خبر انجم نے خوابِ ناز میں سوئی ہوئی نغمی

کا عکس جمیل اُتار لیا۔۔۔ مگر وہ بدستور سو رہی تھی۔ انجم نے نغمی کے چُنے ہوئے ٹوکری میں سے سب پھول اس کے چہرے پر نچھاور کر دیئے بس کی خوفناک آواز نغمی کے منہ سے نکلی انجم نے اس کی خون آلودہ پیشانی کو دیکھا جہاں سے ایک چھوٹا سا زہریلا سانپ بل کھاتا پھولوں پر سے تیرتا ہوا یاسمین کے گھنے کنج میں جا کر غائب ہو گیا نغمی نے صرف ایک بار آنکھیں کھولیں شاید یہ دیکھنے کے لیئے کہ مجھ کو ابدی نیند سلانے والا کون ہے؟ انجم کو اظہار غم کی طاقت نہ تھی وہ خاموش تھا اس کی زبان سے بے اختیاری کے عالم میں نکلا آہ! گلچین!!

پھرتے ہیں دونوں اُس بت خوشرو کو ڈھونڈھتے
خورشید سارا دن ماہِ کامل تمام رات

صحیح انتخاب

شاہد کی عمر پندرہ برس کی تھی جب اس کا عقد رخسانہ سے ہؤا تھا
شاہد کو انٹرنس کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ یونیورسٹی بھر میں اول رہا۔ اب وہ کالج میں ایم۔ اے کے سیکنڈ ایر میں تعلیم پا رہا تھا اس کم عمری میں اُس نے جو حیرت انگیز ترقی حاصل کی اس کا واحد سبب صرف شاہد کی کوہ وقار طبیعت اور اس کا غیر متزلزل عزم تھا۔

اس نے قلیل مدت میں وہ ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی جو بڑے بڑے پروفیسروں کو بھی نصیب نہیں ہوتی کالج میں کوئی ایسا لڑکا نہ تھا جس کے کان شاہد کے بلند قہقہوں اور اس کی پر مذاق مگر مہذب گفتگو سے آشنا نہ ہوں۔

شاہد حسن پرست تھا، آزاد تعلیم سے بری نہ تھا وہ اکثر مسئلہ شادی پر بحث چھیڑے رکھتا اور اُس کے تمام دوست اس موضوع پر تبادلہ خیالات کرتے۔

اگرچہ رخسانہ کا عقد شاہد سے ہو چکا تھا۔ مگر رخصتی باقی تھی جس کے سبب رخسانہ مشرقی پابندیوں اور شرم حیا کی بدولت شاہد کی وسعت نظر سے پوشیدہ یا یوں کہہ دوں کہ پردہ نشین تھی۔ مگر شاہد کو یہ رواجی

پابندیاں سخت ناگوار تھیں۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ جب اسلام کھلم کھلا اجازت دیتا ہے تو اس کے کیا معنی کہ لڑکے کو حسب انتخاب شادی کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ شاہد خوبصورت تھا خوش اخلاق تھا اور مغربی تہذیب و تمدن کا حقیقی پرستار، مسئلہ ازدواج کے متعلق اس کی رائے نہایت آزاد تھی کہ حیات مشترکہ کا فیصلہ کرتے وقت ایک نوجوان کو قطعاً آزاد ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق رفیقہ حیات کا انتخاب کر سکے۔ شاہد کے والدین کی تمنا تھی کہ رخسانہ جو طبعاً نیک، سلیقہ شعار اور ایف۔ اے میں تعلیم پا رہی تھی اس کی دُولہن بنے۔ لیکن شاہد یہ مسئلہ اپنی پسند کے مطابق طے کرنا چاہتا تھا۔ خاندان کے اندر شادی کرنے کا جو رواج بعض خاندانوں میں بکثرت رائج ہے اس کو شاہد ہمیشہ بُری نظر سے دیکھتا تھا۔

رخسانہ شاہد کے ساتھ اس وقت تک کہ وہ اپنی شادی خود کہیں نہ کرے وہی توقعات رکھنا مناسب سمجھتی جو ایک مشرقی سنجیدہ اور شریف عورت رکھ سکتی ہے۔ رخسانہ شاہد سے محبت کرتی تھی۔ مگر اس کی محبت بالکل سادہ اور بے لوث تھی۔ مگر شاہد سخت دل، شاہد کو کبھی یہ محسوس کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ کہ رخسانہ کو میری ذات سے کچھ امیدیں وابستہ ہیں!

شاہد سنگ مرمر کی ایک گول میز پر دونوں کہنیاں ٹیکے ہوئے اس بلوریں جام کی طرف دیکھ رہا تھا جو شراب کی رنگ و بُو کو محصور کئے ہوئے اس کے سامنے بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ ایک جانکاہ مصیبت کے خیال میں مبتلا تھا۔ اور اس ابتلا کے احساس کو عشرت عارضی کے

اس مسرور تاثر میں فنا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خیالات کے ہمہ گیر اثرات اس قدر جلد فنا ہونے والے نہ تھے۔ وہ آج خلاف معمول اپنی زندگی کے گذشتہ واقعات پر غور کر رہا تھا۔ شاہد کو وہ دن جب اس کی طرف سے اس کی ماموں زاد بہن رخسانہ کے ہاتھ میں ہیرے کی ایک انگوٹھی پہنائی گئی تھی اس طرح یاد تھا۔ جس طرح مجرم کو اپنی قید کا پہلا دن۔

رات کی تاریکی میں سارا عالم پوشیدہ تھا صرف تاریکی ہی نے اپنا سکہ نہیں جمایا تھا بلکہ سردی بھی پورے زور سے اپنا اثر ڈال رہی تھی۔ کوئی متنفس ایسی خوفناک رات میں راستہ چلنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن شاہد اپنے قلب کے ایک اختلاج آفریں اضطراب کے سبب باہر سڑک پر جا رہا تھا۔ فضائے عالم پر ایک دہشتناک سناٹا طاری تھا البتہ کبھی کبھی جنگل کے گیدڑ یا آوارہ کتوں کی خوفناک آواز خاموش فضا کے سکوت کو توڑ دیتی تھی۔

شاہد کے نظام اعصاب میں ایک تباہ کن ہیجان تھا۔ دماغ میں عجیب بدنظمی، بے ترتیبی اور تشویش رونما تھی وہ چند دنوں سے رخصت لے کر تبدیل آب و ہوا کے لئے منصوری پہاڑ آیا تھا۔ آج بھی حسب معمول کھلی فضا میں مصروف خرام تھا۔

حسن اتفاق سڑک کے داہنی جانب تیز تیز قدم اٹھائے جا رہا تھا کہ یکایک رُک گیا۔ اور جلدی سے ٹارچ کو جیب سے نکالا۔ دیکھا کہ ایک چرمی بیگ سڑک کے وسط میں پڑا ہے۔ شاہد نے تھوڑے سے تامّل کے بعد

اُٹھالیا۔ بیگ میں چند دیگر لوازمات کے علاوہ ایک حسین جمیل نسوانی تصویر بھی تھی۔ شاہد نے اپنے دل کی اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں پہروں غور کر رہا تھا۔ آج اس بات پہ آمادہ ہو گیا کہ میں ہمیشہ کے لئے رخسانہ سے بے نیاز ہو کر گم گشتہ محبت میں کھو جاؤں۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے تصویر کے راز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھیانک تیرگی فضا تمام کوہ پر چھائی ہوئی تھی۔ شاہد نے ایک بار تصویر سے نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا قسمت! صد افسوس! ساغر جذبات تو کیوں چھلک پڑا۔ افسوس میرا مقصود تو کچھ اور تھا۔ میری زندگی ایک سادہ زندگی تھی۔ میرے خیالات میں بلند پروازی تھی اور قلب کو اطمینان، میرے جذبات کو سکون تھا اور روح کو چین۔ مگر ایک تڑپنے ہوئے شرارہ حُسن نے میرے ہوش و عقل کو خاکستر کر دیا۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

شاہد سوچ رہا تھا عجیب کشمکش کے عالم میں تھا اُس کا خیال تھا کہ اخبارات کے ذریعہ اعلان کر دوں کہ ایک چرمی بیگ دستیاب ہوا ہے صحیح مالک اپنا مفصل پتہ اور تمام اشیاء نام بنام لکھ کر بھیجدے تاکہ بیگ محفوظ طور پہنچا کر مالک کا صحیح پتہ معلوم کر سکے۔ لیکن یکلخت وہ اس خیال میں مستغرق ہو گیا کہ رخسانہ سے میرا دامن کس طرح چھوٹ سکیگا شاہد کی تمام جائداد چالیس ہزار مہر کے علاوہ رخسانہ کے نام

وقف تھی۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ میں اپنے خنجر آبدار سے اُس کا شیشۂ ہستی سنگِ قضا سے چور چور کر دوں۔

رخسانہ کے کالج میں تعطیل تھی۔ وہ اپنے وطن آئی ہوئی تھی رخسانہ کے والدین معہ دیگر اعزا کے ایک شادی پہ گئے ہوئے تھے رخسانہ اپنی بوڑھی انا کے پاس گھر پہ موجود تھا۔ شاہد نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا دوسرے دن وہ روانہ ہوگیا۔

موسم سرما کا شباب تھا۔ سردی زوروں پہ تھی۔ فضائے کائنات کا ہر ذی حیات شدت برودت کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا تھا غربا کے لئے تو یہ زمانہ پیامِ اذیت و کلفت کا حکم رکھتا ہے۔ مگر امراء جو اپنے لذائذ عیش و مسرت کی تکمیل کے لئے اس موسم کے انتظار میں رہتے ہیں اپنے سامانِ امارت کی نمائش میں مشغول ہو گئے تھے رخسانہ اس وقت ایک خوبصورت سیاہ چسٹر میں ملبوس تھی اس کا کمرہ نہایت مناسب نزاکت سے سجا ہوا تھا۔ ایک طرف شیشہ کی الماری میں سنہری جلد کی کتابیں رکھی تھیں اور ہر چیز لکڑی کی بنی ہوئی تھی جو دیواروں کے ساتھ لگ کر حسنِ آرائش کو دوبالا کر رہی تھیں۔

فرش پہ بادامی رنگ کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ مسہری کے چاروں طرف خوبصورت پردے جو نیلے ریشم کے فیتوں سے بندھے ہوئے تھے۔ کشمیر کا ریشمی پلنگ پوش جس پر نیلا کشیدہ

بنا تھا عجیب بہار دے رہا تھا۔

رخسانہ اپنی خوشنما کھڑکی میں خاموش و افسردہ کھڑی تھی خوشبو سے مہکی ہوئی ہوا کے دلفریب جھونکے اس کے شب گوں بالوں کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کوئی الم نصیب اس سکوت شب میں ستار بجا کر گا رہا تھا۔

طربِ دل سے بیاباں بھی ہے رشکِ گلشن
دل ہو ناخوش تو ہو گلشن میں بیاباں پیدا

اس نغمہ درد آلود نے رخسانہ کو بے چین کر دیا وہ افسردگی کے ساتھ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ آہ! میرا خیال تھا کہ میرا مستقبل نہایت شاندار ہوگا اور میری زندگی مسلسل خندہ مسرت بنی رہیگی مگر افسوس یہ اُمید مجھے فریب دے گی۔ حد درجہ اندوہناک فریب میری آرزوؤں کا انتہائی بے دردی کے ساتھ خون ہوگا۔

رخسانہ انہیں خیالات میں محو تھی ۔۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور سامنے کا دروازہ کھل گیا۔ دھماکے کی آواز سے رخسانہ کچھ خوفزدہ سی ہوگئی۔

رخسانہ نے کئی بار قصد کیا کہ دروازہ مقفل کر دوں مگر اس نے دروازہ بند کئے بغیر اپنے آپ کو ایک صوفہ پر ڈال دیا اور غنودگی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

رخسانہ گذشتہ دنوں علیل رہی تھی جس کے باعث کالج کا

تمام کام ویسے ہی پڑا تھا۔ آج وہ اسٹڈی کی خاطر کافی رات جاگنا چاہتی تھی۔ لیکن فطرت کی مخمور آنکھوں نے اس پر کچھ ایسا اثر ڈالا۔ کہ وہ خلاف معمول بہت جلد سو گئی۔

کوٹھی کے بالمقابل ایک کار نہایت تیزی سے آکر رکی۔ شاہد موٹر سے باہر نکلا اور بغیر کسی تامل کے پردہ اُٹھا کر اندر کمرہ میں آگیا تیز دھار خنجر شاہد کے ہاتھ میں بخوبی چمک رہا تھا۔ رات بھی کس قدر حسین اور رومانوی رات تھی۔ موسم سرما کا چاند اپنی پوری دلآویزی کے ساتھ چرخ نیلگوں پہ چمک رہا تھا۔ رخسانہ کی سیاہ نرگسی آنکھیں بند تھیں اس کے لانبے لانبے کھلے ہوئے بال برقی روشنی میں آبنوس کی طرح چمک رہے تھے۔ شاہد نے خنجر کو حرکت دی یکایک اس کی نگاہیں خواب ناز میں سوئی ہوئی رخسانہ کے چہرہ پر پیوست ہو گئیں۔

شاہد کے تمام سفاک خیالات تاثرات محبت میں فنا ہو کر رہ گئے۔ جو تصویر شاہد کو منصوری میں ملی تھی اس میں اور رخسانہ میں کچھ فرق نہ تھا۔ رخسانہ کا چہرہ آرزو کی طرح رنگین اور زرنگار تھا۔ اس کے بالوں میں غیر مطیع گھنگھورو جو دکھتے ایسے گھونگھر وجن میں بہار کی آرائش اُلجھی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جو موسیقی کی تانوں کی طرح لہریں لیتے تھے۔ شاہد کچھ دیر سراسیمگی کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر سرعت کے ساتھ کمرہ سے باہر نکل گیا۔

اب شاہد مسرور تھا اور ساتھ ہی مغرور بھی۔ اس لئے کہ دنیا کی بہترین نعمت فطرت کا حسین ترین عطیہ، بہار کی رنگینیوں کا ایک نظر فریب مجموعہ رخسانہ اس کے پاس تھی۔

موسم سرما رخصت ہو رہا تھا۔ بہار کے آغاز میں ہی رخسانہ کشمیر کے حیات افروز فضاؤں کو دیکھنے کی تیاری میں مصروف تھی۔
شاہد نے دو ماہ کی رخصت لے لی اور یہ حسین جوڑا عازم کشمیر ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر رخسانہ کی زندگی کس قدر حامل طرب و نشاط ہو کر گزر رہی تھی۔ کشمیر کے حسین و جمیل آبشار، ارم فریب لالہ زاروں کوثر جمال جھیلوں، برف پوش کوہستانوں اور رنگ و بو ریز وادیوں میں رخسانہ نشاط و مسرت کے لامحدود جذبات میں منسلک تھی
ایک دن رخسانہ کے مشورہ سے شاہد نے چنار باغ کی سیر کا پروگرام بنایا۔ اور کشتی بھی مخصوص کر لی۔ چاند کی چودہویں تاریخ تھی۔ چار بجے روانہ ہو گئے۔ چاند اپنی پوری دلآویزی کے ساتھ مسند حکومت پر جلوہ گر تھا ــــ

زر بار شعاعوں نے تمام ڈل کو بحر زریں بنا دیا تھا۔ زرق برق موجیں ایک نشاط انگیز پیغام بن کر اُٹھ رہی تھیں۔ اس عالم وجد و کیف میں ان کی کشتی سطح آب پر مصروف خرام تھی۔ رخسانہ کشتی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا۔ آہ! نگار کی زندگی نے ذرا وفا نہ کی ــــ!

شاہد صاحب میں کیا کہوں۔ کہ گذشتہ سال منصوری میں اُس کے ہمراہ کتنا لطف رہا تھا۔ نگار کی وہ محویت کامل اور معصوم بے خبری ایک طلسم کی طرح اس کی مرمریں انگلیاں وائیلن کے تاروں پر رقص کر رہی تھیں۔ سرود و نغمہ کے ساتھ اُس کی اثر گیر ہم آہنگی نے ایک حشر موسیقی بر پا کر دیا تھا۔

نگار اگر آج بھی ہوتی۔ تو کشمیر کے ہر منظر کی طرح وہ قیامت بھی بے حد دلفریب ہوتی۔ افسوس اُس کی آخری یادگار بھی میرے پاس محفوظ نہ رہ سکی۔

ایک پر فضا مقام پر اُس نے میرا فوٹو لیا تھا۔ جو اُس کے فن مصوّری کی بہترین یادگار تھی۔ افسوس وہ تصویر کہیں منصوری میں ہی غائب ہو گئی تھی۔

شاہد نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ اگر وہ فوٹو تمہیں مل جائے تو پھر؟

میرے لئے بہت مبارک دن ہو کہ میں اپنی کھوئی ہوئی تصویر کو پا دُں۔ رخسانہ نے مسرت سے بے خود ہو کر جواب دیا۔

شاہد نے اپنا بیگ کھولا جس میں اس کی قیمتی چیزیں تھیں۔ صندل کی لکڑی کے ایک خوبصورت ڈبہ سے رخسانہ کی تصویر نکال کر رخسانہ کے پیش کر دی ✣

دیمک

کل اچانک نیلو فر آئی تو زوبی نے جب ٹوٹی ہوئی پیالیوں میں اُسے چائے پلائی تو شرم سے اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔

توبہ اللہ! یہ سفید پوشی اور خود داری قائم رکھنا کتنا مشکل ہے۔ زوبی نے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے نئی پیالیاں جو آج خرید کر لائی تھی ڈبہ میں ڈال کر ایک طرف کو رکھ دیں۔ کہ ساحر ناچتا ہوا زوبی کے پاس آیا۔ جس کے میلے آنچل میں چونی کے پیسے بندھے ہوئے لٹک رہے تھے اور وہ چولھے میں آگ جلا رہی تھی۔ لکڑی گیلی تھی اور پھونکیں مار مار کر اس کا منہ لال ہو گیا تھا۔ آنکھیں پرآب تھیں اور بالوں میں راکھ جمی ہوئی تھی۔

ساحر نے جھک کر "پین" ماں کی آنکھوں کے سامنے لے جا کر کہا کل میں اپنی کلاس میں سب لڑکوں سے زیادہ خوشخطی میں نمبر لونگا قلم نہ ہونے کے باعث مجھے کتنی تکلیف تھی۔ اب تو سب لڑکے میرے پن کو گھور گھور کر دیکھیں گے۔ آج مجھے وہ کھوئی ہوئی دونی بھی مل گئی جو میرے کوٹ کی جیب سے گم ہو گئی تھی وہ کہیں

گری نہ تھی۔ بلکہ جیب اندر سے پھٹی ہوئی تھی اور دونی کوٹ کی تہ میں جا چھپی تھی۔ جو اب میں نے ٹٹول کر نکال لی ہے۔ یہ کہہ کر ساحر لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ بالٹی پر گرا پانی سے بھری ہوئی بالٹی اُلٹ گئی۔ ڈبہ میں رکھی ہوئی نئی پیالیاں سب ٹوٹ گئیں۔ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ساحر گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اپنی چوٹ اور پیالیوں کا ٹوٹنا بھول کر وہ اپنی پن کو دیکھ رہا تھا۔ جو بالٹی کے نیچے آکر اُس کے بوجھ سے دب کر ٹوٹ گئی تھی۔ اُسے اپنے ہونٹوں سے بہنے والے خون سے زیادہ قلم ٹوٹ کر سیاہی گر جانے کا دکھ تھا۔ اور زوبی کو ٹوٹی ہوئی پیالیوں کا جو اس نے عزت کی پاسداری کی خاطر بڑی مشکل سے خریدی تھیں۔ اُسے نہ ساحر کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے خون کے سرخ قطرے متاثر کر سکے اور نہ نیلی سیاہی کے گرنے کا رنج تھا اُسے تو ٹوٹی پیالیوں کے ریزوں میں اپنی عزت پستی نظر آنے لگی !!!

میں کہتی ہوں تو نے میری قلم کیوں توڑی یہ میں تین دن ہوئے فرحت سے مانگ کر لائی تھی۔ جو تم نے چرا لی اور میں نے جانا اسکول سے آتے ہوئے راستہ میں کہیں گر پڑی۔ اب بتاؤ میں فرحت کو کیا جواب دوں ؟ بڑی لڑکی نجمی نے چلا کر کہا !!

وہی جو تم نے راستہ میں پن گر جانے کے خیال سے پرسوں فرحت کو دیا ہوگا ــــــ !! ساحر نے اپنے ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کو

پونچھ کر اتنے زور سے کہا کہ اُس کی گردن کی سب رگیں اُبھر آئیں۔

زوہی نے ایک نظر ٹوٹی ہوئی پیالیوں پر ڈالی اور دوسری نجمی کے شکستہ پن پر اور دِل ساحر کے بہتے خون کے ساتھ شدت مامتا سے بے تاب ہو کر تڑپنے لگا۔

زوہی نے اپنے میلے آنچل سے ساحر کا خون صاف کیا اور اُسے دلاسہ دے کر دو آنے دیئے۔ تاکہ وہ چپ ہو جائے۔ یہ دیکھ کر ننھا پلنگ کی پیری سے اچھل کر نیچے اترا اور زوہی کا آنچل اپنے دانتوں میں دبا کر پھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے مچل کر بولا۔ میرا قاعدہ پھٹا ہوا ہے میری دوات بھی ٹوٹ گئی ہے۔ ماسٹر مجھے مارتا ہے اور کہتا ہے۔ نیا قاعدہ خرید کر لاؤ۔ مجھے بھی پیسے دو۔

یہ سُن کر زوہی نے اپنے آنچل میں بندھی ہوئی چونی کی طرف دیکھا جو رات کی ترکاری کے لئے اس کے پاس تھی۔ پھر زوہی کی للکار سنائی دی۔ بچوں کو شور وغل سے باز رکھنے کے لئے وہ ان سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگی۔ اتنے میں بچوں کے ابا آ گئے اور پوچھا۔ ارے کم بختو تمہیں آج پڑھنے کے لئے نہیں جانا؟

جی نہیں آج چھٹی ہے۔ نجمی نے متانت سے جواب دیا۔!! پھر زوہی سے شوہر نے کہا کھانا لاؤ۔!!

ذرا صبر کیجئے، بیٹھ جائیے میں ابھی پکاتی ہوں۔ زوہی نے جواب دیا۔

وہ اسٹول پر ٹڈے کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر گیلی لکڑیاں تیز آنچ دینے کے بجائے آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں۔

بہت دیر ہوگئی میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ کھانا پکنے تک بیٹھا رہوں۔!

زدبی کا شوہر ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اچھل پڑا۔ اس نے اپنی صورت پر ایسی مظلومیت طاری کر لی جیسے ہفتہ بھر سے اُسے کھانا نہ ملا ہو۔ اور نہ آئندہ ملنے کی اُمید ہو۔

ہائے میں مرگئی! وہ بھوکے ہی چلے گئے!! زدبی نے نجمی کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو گرد و غبار سے آلودہ لٹکائے وہ پھر رہی تھی۔ دیکھو تو بالوں کی لٹیں کیسی اُلجھ رہی ہیں ہزار دفعہ کہا کہ دو چوٹیاں نہ کیا کر بال صاف کر کے ایک چوٹی میں کس کر باندھ دیا کر!!

اتنے گھنے بال ایک چوٹی میں سمٹتے کہاں ہیں؟؟ یہ کہہ کر نجمی زور سے پاؤں مارتی ہوئی غسل خانہ کی طرف سر دھونے کو چلی گئی۔ امّی امّی ذرا صابن تو دیں۔ نجمی نے سر دھوتے ہوئے آواز دی!!

زدبی نے جو آٹا گوندھ رہی تھی بے پروائی سے جواب دیا۔ چل آج سر نہ دھو صابن ختم ہو چکا ہے۔ جب وہ لائیں گے پھر دھو لینا!!

آدھے سوکھے آدھے گیلے بالوں کا بوجھ نجمی اپنی نازک کمر پہ اُٹھائے غسل خانہ سے نکلی تو ٹپ ٹپ پانی کے قطرے اس کی کمر سے پھسل کر زمین پر اس طرح گر رہے تھے جیسے اس کی نرگسی آنکھوں کے سرمئی

پپوٹوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔!!

ساحر اور ننھا زوبی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ امی پیسے دیں۔ دونوں نے ایک ساتھ مانگے۔!! زوبی نے آنچل کی گرہ سے پیسے نکالے اور پھر شام کی ترکاری کا خیال کر کے باندھ دیئے۔ اُف توبہ وہ صبح بھی بغیر کھانا کھائے چلے گئے تھے اب اگر شام کو ترکاری نہ بنی تو؟؟

یہ سوچ کر زوبی نے چونی باندھ دی اور کہا شاباش! شاباش! کتنے اچھے میرے بیٹے ہیں۔ لو اب بیٹھو کھانا کھالو۔ ساحر تمہاری آپا کہاں ہیں؟؟

وہ مشین سے لپٹی رو رہی ہیں۔ یہ کہہ کر ننھا اور ساحر بھی مُنہ بسور کر باہر چلے گئے۔!!!

زوبی باورچی خانہ سے اُٹھی اور نجمی کے پاس گئی جو پھٹی ہوئی قمیض کو مشین کے آگے رکھے رو رہی تھی۔ زوبی چپ چاپ اُس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور شدت احساس کے ساتھ خود بھی رونے لگی۔ ماں کو روتے دیکھ کر نجمی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!!

زوبی اپنا رونا بند کر کے نجمی کو چپ کرانے لگی۔ پگلی تجھے معلوم نہیں کہ تیری ماں تجھ سے کتنا پیار کرتی ہے۔ تیرے پاس اچھے کپڑے نہیں خرچ کرنے کے لئے پیسے نہیں۔ لیکن تیری ماں تجھ سے تہ دل سے محبت کرتی ہے۔ تو کیوں رو رہی ہے۔ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ تیری ماں بے انصاف ہے، جابر ہے، بے رحم ہے، اپنے بال دیکھ

ان کی دیکھ بھال کیا کر کتنے لانبے کتنے کالے کتنے گھنے ہیں تیرے بال۔ جب بیٹی ماں کے برابر ہو جائے تو وہ بیٹی نہیں رہتی بلکہ بہن بن جاتی ہے تجھ کو چاہیئے۔ اب ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ میں اب تھک گئی ہوں میرا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ لیکن تو ہے میری نصیحت پر عمل کرنے کے بجائے رونے لگتی ہے۔!!

امّی میں رو اس لئے رہی ہوں کہ میرے بال جھڑ رہے ہیں نہ صابن ہے کہ سر دھوؤں نہ تیل ہے کہ انہیں سنوار سکوں نجمی یہ کہہ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اور زوبی نجمی کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ کس قدر بھرا ہوا لچکدار بے عیب بے داغ مہکا ہوا جسم خوبصورت مکمل دلفریب جاذب نظر بل کھاتے لہراتے ہوئے بال جوں جوں نجمی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ توں توں اپنی ماں کے دل کے قریب ہوتی جاتی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے غلیظ بالوں کو چوما اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے اتنے میں نجمی کی سہیلی فرحت آ گئی اور کہا آپ رونے میں اس قدر محو ہیں کہ میرے آنے کی خبر بھی نہیں ہوئی!!!

اوہ میں اپنی چھوٹی بہن کو یاد کر کے رو رہی تھی — نجمی کے چہرے پر سب سے زیادہ دلکش چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے ہنستی، آنکھوں سے روتی، آنکھوں سے سُنتی، آنکھوں سے ہی باتیں کرتی تھی۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی آنکھیں جُھکا لیں۔

صبح کے ہنگامے کے بعد شام کے ہنگاموں کا دور شروع ہوا۔

اور پھر رونا دھونا، چیخنا، چلانا، مارنا پیٹنا، پیار دلاسا سب کچھ ہو چکا تو بچے پڑ کر سو گئے۔ کالی رات — تاریکی ہی تاریکی وسیع آسمان پر پھیلی ہوئی اردگرد کی سب چیزیں تاروں کی چھاؤں میں ایک دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ زوبیؔ دیوار پر کہنی ٹیکے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے تھکی ماندی سی کھڑی ننھے کی معصوم تمنا نیا قاعدہ، ساحرہ کی نوخیز آرزو خوبصورت پن اور نجمیؔ کی پرارمان نگاہیں اپنی پھٹی ہوئی قمیض سے ہٹ کر فرحت کے نفیس اور جدید پرنٹ پر جمی ہوئی عالم تصور میں دکھائی دے رہی تھیں — کہ اسی حالت میں زوبیؔ چکرا کر گری!!!

صبح کو جب زوبی کا شوہر ایبٹ آباد سے واپس آیا۔ تو اس کی ابتر حالت دیکھ کر محلہ کے حکیم جی کو بلا لایا۔ جنہوں نے نبض دیکھ کر بتایا کہ دق نے دیمک کی طرح اس کے پھیپھڑوں بلکہ تمام جسم کو چاٹ دیا ہے۔!!!

زندگی یا موت؟

عذرا نہ صرف جوان تھی بلکہ حسن کی دولت سے بھی مالامال اس کا دل زندگی کے سود و زیاں سے ناآشنا تھا وہ دکھ درد کی زندگی سے ناواقف تھی۔ اس کی زندگی ایک مسلسل قہقہہ تھی۔ اس کی ہم جماعت لڑکیاں اُسے قدر و قیمت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ عذرا کی جسمانی نشو و نما کے لئے پوری فراغتیں میسر تھیں اس لئے وہ روز بروز نکھرتی جاتی تھی۔ اُس کی معصوم اداؤں میں ایک کشش تھی۔ اس کی دوشیزگی کی فرحت سے اس کے گھر کی ساری فضا مہک رہی تھی اور وہ ایک نازک اور حسین تیتری تھی۔ جو اِدھر اُدھر محوِ خرام رہتی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے اس نوبہار نازک کو ریاض جیسے خونی بھیڑیئے کے ساتھ آئندہ لمحات زندگی گذارنے لکھ دیئے تھے۔

ریاض خوبصورت تھا دولتمند تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا لیکن پرلے درجہ کا سفاک اور سخت دل واقع ہوا تھا۔ وہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ جوان اس سے کتراتے تھے بچے اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے اس کی زندگی تاریک تھی لیکن وہ خود کو اعلیٰ سوسائٹی کا فرد سمجھتا تھا وہ اپنی جائداد کا تنہا مالک تھا ایام کمسنی میں ہی اُس کے سر سے ماں باپ کا

سایہ اُٹھ گیا تھا۔

عذرا کی ماں فریدہ کی دلی خواہش تھی کہ عذرا کی زندگی ریاض سے وابستہ کی جائے۔ لیکن عذرا کے باپ نواب افراسیاب کی رائے بیگم سے مختلف تھی!!

ریاض رخصتوں کے ایام زرّین لاج میں گزار رہا تھا کیونکہ ریاض کا سوائے اپنی خالہ فریدہ کے اور کوئی قریبی عزیز نہ تھا۔ اس کی جائداد کی وسیع آمدنی کا بندوبست بیگم فریدہ کے اختیار میں تھا اور اسی دولت کی چاشنی ریاض کی برائیوں پر پردہ ڈال کر فریدہ کے سامنے اس کی خوبیاں ظاہر کرتی تھی۔

انٹرنس کی کامیابی کے بعد سب کا ارادہ تھا کہ عذرا کی تعلیم ختم کرا دی جائے۔ عذرا میں روز بروز متانت اور بردباری پیدا ہو رہی تھی اور اب شباب کے ساتھ اس کی سلیقہ مندی میں اضافہ ہو رہا تھا ریاض نے ایم اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اب وہ انگلستان جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ ریاض اور عذرا کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور یہی وجہ تھی کہ ریاض عذرا کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا جس کا احساس عذرا کے دل میں بھی تھا۔ اور اس کو بھی ریاض سے ایک حد تک نفرت تھی۔ لیکن یہ نفرت عذرا کے دل کی عمیق گہرائیوں میں اقامت گزین تھی۔ البتہ ریاض کے دلی خیالات کا اظہار ایسے موقعہ پر ہو جاتا تھا جب وہ عذرا کے ہر فعل کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ایسے الفاظ

کہہ دیتا جس سے عذرا کی معصوم آرزوؤں کا خاتمہ ہو جاتا اور وہ اُس بُلبل کی طرح سہم جاتی جو پنجہ صیاد کی گرفت میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے قفس کی آہنی سلاخوں کو بغور دیکھے۔

ریاض اگر کوئی بات عذرا سے کرتا تو اس کی آواز میں کرختگی اُس کی زبان کی لکنت اس کے لبوں پر ایک ارتعاشی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

نواب صاحب ریاض کے اس طرز عمل سے اثر لیتے ہوئے دبی زبان سے بیگم فریدہ سے اختلاف طبع کا اظہار کرتے مگر بیگم فریدہ بے پرواہی سے کہہ دیتی ریاض بڑے بھائی ہونے کا ثبوت دینے کی خاطر اکثر بگڑ جاتا ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ !!

بیگم فریدہ کھڑکی میں کھڑی باہر کی فضا دیکھنے میں محو تھی۔ نواب صاحب کمرے کے پرے سرے پر کھڑے رشتہ داروں کی تصاویر دیکھ کر ایک روحانی لذت سے لطف اندوز ہو رہے تھے موسم بہار عین شباب پر تھا خوشبو سے بھری ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔

فاختہ ندی کے کنارے بیٹھی بول رہی تھی آفتاب پر ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے اور غروب آفتاب سے پہلے آفتاب نے تاریکی کا نقاب اوڑھ لیا تھا۔

نواب صاحب بیگم فریدہ کے کمرے میں آئے کچھ دیر عالم گومگو میں کھڑے رہے پھر بولے اندھیرا ہو گیا ہے کمرے میں روشنی نہیں کی آپ نے ؟

بیگم فریدہ تعظیماً کھڑی ہو گئی اور کہا معاف کیجئے مجھے آپ کے آنے

کی مطلق خبر نہیں ہوئی۔

خبر کیوں ہوتی آپ تو مجسمہ حیرت بنی بیٹھی تھیں روشنی کریں مجھے اندھیرے میں وحشت معلوم ہوتی ہے۔ نواب صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

سرِ شام روشنی کر دینی مجھے پسند نہیں یہ کہتے ہوئے بیگم فریدہ اٹھیں اور بجلی کا بٹن کھول دیا۔ کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔ نواب صاحب نے سگار سلگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

شوفر موٹر تیار کرو۔ نواب صاحب نے بلند آواز سے کہا!

حضور مس صاحبہ آج خود موٹر کالج لے گئی ہیں۔

کیا عذرا واپس نہیں آئی نواب صاحب نے پوچھا؟ جی نہیں یہ کہہ کر شوفر گیٹ سے باہر چلا گیا ـــــ !!

نواب صاحب پھر کمرہ میں آئے اور بے اختیاری کے عالم میں اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور بیگم فریدہ گھبراہٹ سے اندر آئیں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات ان کو یاد آجائے کہنے لگیں عذرا ابھی تک واپس نہیں آئی آج اس نے ایک ہلکا سا جمپر پہنا تھا۔ کہیں سردی کی وجہ سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ کالج کی واپسی پر اس نے "ندیم منزل" میں جانا تھا۔ نسرین نے اسے ٹی پارٹی میں بلایا تھا۔ لیکن اب تو اسے واپس آجانا چاہیئے تھا کافی دیر ہو گئی شوفر کو "ندیم منزل" بھیجو وہ خبر لے آئے گا نواب صاحب نے نظر بر اخبار

پر جاتے ہوئے کہا۔ بہت بہتر!! بیگم فریدہ باہر چلی گئیں۔
تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور کہنے لگی عذرا اب تعلیم سے فراغت پا چکی ہے زندگی کا بھروسہ نہیں ریاض کے انگلینڈ جانے سے پہلے ان دونوں کو ازدواجی رشتہ میں منسلک کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ نواب صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں کوٹھی کے احاطہ میں موٹر کے ہارن کی آواز گونجی نواب صاحب بے اختیار ہو کر باہر گئے۔۔

عذرا آہستہ خرامی سے برآمدہ کی سیڑھیاں طے کر کے کمرہ میں آئی بیگم فریدہ نے اُسے آتشدان کے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ عذرا بیٹی تم برف کی قاش ہو مجھے فکر ہو گیا تھا کہ سردی میں تم بیمار نہ ہو گئی ہو۔ ابھی شوفر کو تمہاری خبر لینے "ندیم منزل" بھیجا تھا راستہ میں ہی کہیں جاتا ہو گا۔

نہیں امی جان میں جلدی آجاتی لیکن شمیمہ کا تار ملا کہ وہ آج چار بجے یہاں پہنچے گی ہم سب اُسے لینے اسٹیشن چلے گئے پھر کچھ وقت باتوں میں صرف ہو گیا۔
نواب صاحب نے پوچھا بیٹی عذرا کیا تمہاری سہیلی شمیمہ طاہرہ آگئیں؟
جی ہاں ابا جان وہ اپنی تعلیم کی وجہ سے زیادہ باہر ہی رہیں بی اے آنرز کیا ہے۔ عذرا نے جواب دیا۔

تب تو تم مبارکباد کی مستحق ہو مدت کے بعد آپس میں ملیں، نواب صاحب نے کہا۔

شکریہ ابا جان! اب اجازت دیں میں خوابگاہ میں جا رہی ہوں یہ

کہہ کر عذرا اٹھی۔

کیا کھانا نہیں کھاؤ گی۔ بیگم فریدہ نے پوچھا!

امی جان مجھے بھوک نہیں عذرا خواب گاہ میں جاتے ہوئے بولی۔

عذرا کے جانے کے بعد نواب صاحب نے بیگم فریدہ سے کہا بیگم میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری یہ کوتاہ اندیشیاں عذرا کی زندگی کو تاریک بلکہ خاکستر کر دینگی موجودہ بدمزگیوں کا سبب یہ ہے کہ ماں باپ نے فریقین کی طبیعتوں کا اندازہ کئے بغیر انہیں ایک دوسرے کے سر منڈھ دیا جتنے گھروں میں بدمزگی پھیلتی ہے اسی اختلاف طبع کے باعث۔ تم خیال کرو دو متضاد خیال ہستیاں آپس میں کس طرح نباہ کریں گی؟

بیگم فریدہ نے ترشروئی سے جواب دیا۔!!

کیا میں عذرا اپنی زندگی کے سہارے کو اپنی آرزوؤں کے مرکز کو علیحدہ کردوں ریاض سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی اچھا بر ملنا دشوار ہے میں جبتک زندہ رہوں گی میرے ہی گھر میں میری نظروں کے سامنے رہیگی عذرا کی جدائی کسی دوسری صورت میں مجھ سے برداشت نہ ہو سکے گی۔ کھانے کی گھنٹی بجی اور یہ دونوں کھانا کھانے چلے گئے وہاں آپس میں یہی بحث ہوتی رہی تقریباً ایک بجے یہ اپنی خواب گاہ میں آئے۔!!!

زرّین لاج آج نہایت آراستہ کی گئی۔ وہ دولہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ عذرا نے اپنی سنہری کامیابی پر ایک دعوت کی۔ صبح کی جھلملاتی روشنی میں باغ کے مرمریں روشوں پر عذرا اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں مصروف

گلگشت ہے ان کے متبسم چہرے حسن و معصومیت میں صبح کی شرمیلی دیوی کے تمتماتے ہوئے رخساروں کی مانند ہیں۔ کالے بادل جھوم کر افق سے اُٹھ رہے ہیں صحنِ باغ میں سبزہ کا فرش بچھا تھا۔ گلہائے رنگین کے تختے کھلے ہوئے تھے۔ مہمانوں سے تمام کوٹھی بھری ہوئی تھی۔ نسرین عذرا کے گلے میں بانہیں ڈالے ٹہل رہی تھی۔ کہ فرخندہ ہنستی ہوئی عذرا کے پاس آئی اور کہا ہم اتنی غیر ہوگئیں کہ اطلاع تک نہ دی اور خود یہاں کی فضا سے لطف اندوز ہو رہی ہیں؟

نہیں "فری" اندر بیٹھنے سے طبیعت گھبرانے لگی تھی میں نے خیال کیا ذرا باہر چلی جاؤں۔ تمہیں بلانے کو ہال میں گئی مگر تم نظر نہ آئیں۔

فرخندہ نے مسکرا کر کہا نسرین کو آپ کے ساتھ تو خاص تعلق قلبی ہے وہ صدا آنیازی کے کلام کا تازہ مجموعہ فخریہ آپ کے پیش کرتی ہیں اس ہستی سے تو پہلے ہی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کو قلبی لگاؤ تھا ـــ!!

لیکن جب شوہر بن جائیں گے تو پھر؟ شمینہ نے ہنس کر کہا۔

سب نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور نسرین شرما گئی اور پھر سب ہال میں آکر بیٹھ گئیں۔ مس فرینک نے ہارمونیم اور ستار پر اقبال کی کئی چیزیں سنائیں تھی۔ تو وہ بنگالی مگر اپنی دلکش آواز سے اردو میں اتنا صاف گاتی تھیں کہ لطف آجاتا تھا۔

باغ کا مختصر راستہ طے کر کے پھر یہ کوٹھی کے صدر دالان میں پہنچیں جہاں عذرا نے ایک چیز غالب کی سنائی تمام فضا جھوم رہی

تھی۔ نسرین نے کہا واللہ! غضب کی آواز ہے ہمیں تو مسحور کر دیا۔ فرخندہ بولی۔ نظر نہ لگا دینا چشم بد دور کہو عذرا نے سرگم پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ تم لوگ شرارتوں سے باز نہیں آتیں اچھا اب میں نہیں گاتی۔ مسز فرینک نے بھی اس فن میں ماہر ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا۔ سب بہت مسرور ہوئیں۔ تھوڑی دیر بعد مجلس برخاست ہوئی۔ عذرا نے آج رات فرخندہ اور نسرین کو یہیں ٹھیرا لیا تھا۔

رات اپنی تاریکیوں کو لے کر آ گئی لیکن عذرا ابھی تک مصروف مطالعہ ہے۔ فرخندہ اور نسرین کبھی کی سو چکی تھیں۔ نصف شب گزر چکی تھی تو عذرا بھی لیٹ گئی نیند کے غلبہ سے آنکھ لگ گئی لیکن دیر نہ ہوئی تھی کہ تخیلات کی وہ قوتیں جو اندر ہی اندر کارفرما تھیں زیادہ ہو گئیں تو اچک کر آنکھ کھل گئی۔ اور وہ باہر نکل آئی۔ بزم کی انجم کی نشستوں پہ نظر ڈال کر وہ پھر بستر پر آ گئی۔

عذرا کو ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کو ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا وہ اس وقت سفید نائٹ گون میں ملبوس صوفہ پر نیم دراز تھی اُس کی زلفیں ابر و تنک پھیلی ہوئی تھیں اور بال جوڑے میں بندھے تھے جس سے اس کی سفید بیاض گردن صاف نظر آتی تھی۔ وہ عمر کی اس شاداب منزل میں تھی جہاں عہد طفلی اور شباب کی سرحدیں آپس میں ٹکراتی ہیں اس کی بلا تصنع سادگی کی ادا لبہائے نازک پر پھیلی ہوئی حسرت آمیز تمنا اس کے وہ خوبصورت بال جو سورج کی کرنوں

کی طرح چمکتے تھے۔ اس کے رخسار جن پر شفق کی سُرخی اور صبح کی شادابی بیک وقت موجود تھی اب پھیکے اور زرد نظر آتے تھے وہ اکثر علیل رہنے لگی تھی۔ اُسے ایک قسم کا ہسٹریا لاحق ہوگیا تھا. وہ اکثر بے ہوش ہو جاتی تھی لیکن اس حالت میں سب کچھ سنتی اور محسوس کرتی اس کی آنکھیں بند رہتیں اس بیماری کی عجیب خصوصیات یہ تھیں کہ حملہ سے پیشتر وہ اپنے حرکات و سکنات سے کسی قسم کی علامات ظاہر نہ کرتی تھی اس کے ہوش پراں ہو گئے وہ بسمل بنی ہوئی تھی اور حیران تھی کہ اپنی اس حالت سے وہ کسی کو اطلاع کیسے دے۔ ایک ہلکی آواز سے بمشکل عذرا نے نسرین کو بلایا وہ آنکھیں ملتے حواس باختہ مسہری سے اُٹھ بیٹھی۔ نسرین نے دیکھا۔ نبض کی ہلکی ہلکی حرکت عذرا کی زندگی کا پتہ دے رہی ہے ورنہ وہ مردہ بنی پڑی تھی۔

ٹھیک اس وقت جب خنجر سحر نے نیلائے شب کی کرشمہ سازیوں کے دامن کو چاک کیا۔ بیگم فریدہ کے کانوں میں عذرا کی آواز پہنچی وہ گھبرائی ہوئی عذرا کے پاس آئی۔ اُس نے نورِ نظر کی معصوم نگاہوں میں پیار کو اٹھکیلیاں کرتے دیکھا تو شفقت مادری میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ بے تابانہ اُس سے لپٹ گئی۔

کافی دیر بعد عذرا کی تمام علامات رفتہ رفتہ مفقود ہوگئیں اور اس کی جان میں جان آئی۔ عذرا نے نرم لہجہ میں کہا۔ امی جان اب آپ میرے پاس نہ بیٹھیئے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے آرام کیجئے مجھے بھی

نیند آرہی ہے۔

بیگم فریدہ نے ایک بوسہ عذرا کی منور و پر جمال پیشانی پہ دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عذرا کی تمام رات بے ترتیبی خیالات کی کش مکش میں گزر گئی اور پریشانی کا یہ عالم رہا کہ وہ کسی نتیجے پہ پہنچنے پر قادر نہ ہو سکی۔ وہ ایسی حواس باختہ ہو گئی تھی کہ اُسے اپنے آپ کی خبر بھی نہ تھی۔ لیکن اب اس کے ہوش ٹھکانے پہ تھے۔ نہ وہ اضطرار تھا نہ بیقراری بلکہ ایک سکون اور اطمینان تھا جو چہرہ کی سنجیدگی اور پریشانی کی خندبدگی سے نمایاں ہو کر اس کے کسی عزم راسخ کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کی حرکت و سکون میں اُس مسافر کی ادائیں گرم تقاضا تھیں جو ٹرین پر سوار ہونے کے لئے پلیٹ فارم پر پر اضطراب ٹہلتا ہو۔

فرخندہ ابھی تک محو خواب تھی عذرا اور نسرین باغ میں نکل آئی تھیں شفق کی سرخی ہر چیز کو رنگین بنا رہی تھی سرو کے درخت مغربی آسمان کے بالمقابل اس طرح نظر آتے تھے گویا ان دونوں ہستیوں کے محافظ پہرہ دے رہے ہیں۔

فرخندہ اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملتے ان کے پاس باغ میں جانے کو باہر آئی۔ جس وقت فرخندہ کی نظر عذرا پر پڑی وہ ایک تصویر کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ جو دیکھنے والوں کے دل پہ ایک دائمی نقش بن کر رہ جاتی۔ شفق کی سرخی نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کے خوبصورت بالوں کو آتشیں رنگت دے

رہی تھی۔

اتنے میں فرخندہ اُس کے قریب آ گئی اور عذرا نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا!

خوب سوئیں وہ دن یاد ہے جو کالج لائف میں تمہارے پیش ہوا تھا۔ آہ کتنا خوشگوار زمانہ تھا۔ جبکہ دل دنیا کے تند اور تلخ جذبات کی آلائشوں سے پاک تھا۔ فرخندہ تم نے خوب دغا دی تھی۔ اُس رات میں تقریباً دو بجے سوئی تھی۔ صبح کو خود وقت پر بیدار نہ ہو سکی۔ اور تم مجھے سوتا چھوڑ کر چلی گئیں۔

مس روز جب کمرہ میں آئیں ساری جماعت استقبال کے لئے کھڑی ہو گئی۔ تو تم نے اس وقت میری غیر حاضری کا احساس کیا اور سہم گئیں۔ کیونکہ مس صاحبہ بڑی بدمزاج تھیں۔ تمہیں یقین ہو گیا کہ آج میری شامت آئے گی۔ مگر تم نے جرأت سے کام لیا اور حاضری لگانے سے قبل کہہ دیا۔ کہ عذرا سخت علیل ہے۔ جس سے مس روز نے ایک نگاہ غلط انداز تمہارے چہرے پر ڈالی اور تم نظر بچا کر میرے پاس آئیں اور مجھے جگا کر بہت ڈرایا۔

میں متوحش نظروں سے کمرہ کو دیکھنے لگی۔ مگر تم نے مسکرا کر سب واقعہ بیان کیا اور مجھے ہدایت کی۔ کہ بیمار بن کر لیٹ جاؤ۔ قریب کی میز پر دو دوا کی شیشیاں اور خوبصورت پیمانہ رکھ دیا۔

عذرا گذشتہ زمانہ کی مسرت بخش یاد میں اس طرح محو ہو گئی۔ گویا زمانہ کے طلسمی ہاتھ نے ماضی کو حال بنا دیا۔ یہ سب بت خاموش کی طرح کھڑی تھیں کہ ریاض ایک سیاہ عربی گھوڑے پر تیزی سے گزرا۔ نسرین نے ہنستے ہوئے کہا۔ دیکھو فرخندہ بھائی ریاض نے یہ کیا وقت شکار کا نکالا۔ خدا معلوم عذرا کب تک اسی عالمِ محویت میں رہتی اگر خانساماں یہ اطلاع نہ دیتا کہ چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ چنانچہ سب کمرہ میں واپس آئیں۔ چاء سے فارغ ہو کر عذرا ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی اور فرخندہ و نسرین دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔

کتاب کو ہاتھ سے میز پر رکھتے ہوئے عذرا نے ایک سرد آہ کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں اس کی روح میں کئی ایک خیالات نے ایک قسم کی موسیقی پیدا کر دی اور اس کے دماغ میں ایسے الفاظ جمع ہونے لگے جو ایک دوسرے سے مل کر ترنم پیدا کر رہے تھے۔ چند لمحہ بعد وہ آہستہ آہستہ یہ شعر گنگنانے لگی۔ ؎

وسعتِ آرزو ہوئی آخر کار یاس خیز
ہو گئی تنگ زندگی پلئے طلب بڑھائے کیوں

اس کے رگ و ریشہ میں افسردگی کی ایک نئی لہر متحرک ہو گئی اور وہ خاموش کمرہ کے سکوت میں گنگناتی رہی۔ اس کی روح کا ذرہ ذرہ رقص کر رہا تھا۔

آناً فاناً گرجتے ہوئے بادل چھا گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے اور فضائے نیلگوں کے لامتناہی سمندر میں ایک قیامت آفرین تلاطم برپا ہو گیا ہے جو زمین کی طرف امڈا چلا آرہا ہے۔ تیز و تند آندھی نے پہاڑوں اور درختوں سے ٹکرا کر ایک پُر ہیبت شور برپا کر رکھا تھا وادی کے وحوش وطیور بھی اِس خوفناک منظر اور قوائے قدرت کی اِس ہولناک نمائش سے ڈر ڈر کر اور سہم سہم کر اپنی جائے پناہ میں چھپ گئے تھے۔ بادل کی تاریکیوں میں آناً فاناً ایک روشنی پیدا ہوئی اور تڑپتے ہوئے شعلے دوڑنے لگے کائنات ارضی و سماوی کھلکھلا کر ہنسی اور پھر تاریکی میں غائب ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے سکون اور خاموشی کا عمل ہوا ریاض پانی میں شرابور ہرنی کے خوبصورت بچہ کے بے جان جسم کو گھوڑے پر ڈالے فراٹے بھرتا گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ بارش کی مسلسل بوندیں ہرنی کے زخمی گلے پر پڑتیں اور وہ خون آلود قطرے تمام راستہ ٹپک ٹپک کر اس کی بے کسی کا رونا رو رہے تھے۔ بادل اپنی انتہائی طاقت سے گرجا اور اس کے دل ہلا دینے والے نعرہ نے کائنات میں ایک لرزہ پیدا کر دیا۔

عذرا خوف سے بے قرار ہو رہی تھی اس نے اپنی دونوں انگلیاں کانوں میں ڈال رکھی تھیں۔ کہ سامنے کا سبز پردہ اُٹھا منتشر بال نسرین ایک چیخ کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور کہا۔ آہ! عذرا ریاض

بھائی راکھ کا ڈھیر بن کر گیٹ کے پاس پڑے ہیں ان پر بجلی گری۔ نسرین نے رک رک کر کہا۔

عذرا ایک غیر ارادی قوت کے ساتھ اُٹھی چند قدم چلی۔ لیکن چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ فرخندہ اور نسرین نے اُسے پلنگ پر ڈالا ڈاکٹر کو فون کیا۔ مگر وہاں کیا تھا۔ عذرا کی روح اس کثیف دنیا سے نورانی فضا میں پرواز کر گئی تھی۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ عذرا کی موت حرکت قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی۔ کون بتا سکتا ہے۔ کہ عذرا کی موت دردِ الم سے تھی یا فرطِ مسرت سے اور کسے خبر کہ یہ زندگی تھی یا موت ؟ ؟

اسیرِ قفس

حسین اور معصوم پرندہ اب اپنے رنگین پر پھیلا کر ہوا میں پرواز کرنے لگا تھا۔ اس کی وہ فضائے معصومیت جا چکی تھی جبکہ وہ بے فکر اپنے گھونسلے میں بیٹھ کر ماں کی راہ دیکھا کرتا تھا۔

اب اس کی مشق پرواز ان خوبصورت پھولوں کے پودوں تک ہونے لگی تھی جو اس کی گلابی چونچ سے مشابہت رکھتے تھے اور جن کو وہ ایک مسرورانہ انداز سے گھونسلے میں سے جھک جھک کر دیکھا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنی ماں کو پھولوں کی رنگینی اور لطافت کے سریلے راگ سنایا کرتا تھا۔ اور اس کی ماں اپنے مضبوط پروں کو پھڑپھڑا کر کہتی۔ نادان بچے اس خوشبودار پودے میں تیرے لئے کیا رکھا ہے۔ میں تمہیں تمام دنیا کی سیر کراؤں گی جب تجھے اور زیادہ طاقت پرواز آجائے گی۔

ایک چمکیلی صبح ننھا پرندہ باغ میں گلاب کے پودے پر پھولوں میں پنہاں بیٹھا نغمۂ مسرت الاپ رہا تھا زرد زرد نارنگیوں کی فضا خوشبو کو معطر کر رہی تھی۔ بوڑھا مالی افلاس و تنگدستی سے دبا ہوا کیاریوں کی آبپاشی میں ہمہ تن مصروف تھا باغ

کے مغربی جانب دو انسانی صورتیں نارنگی کے گھنے پیڑوں کے نیچے متحرک نظر آئیں جن کے چہروں سے سفاکی اور بے رحمی صاف طور نمایاں تھی۔ پوشیدہ بہت سی نارنگیاں توڑ کر وہ واپس جا رہے تھے عین اُسی وقت مالی نے اپنا نحیف سر اوپر اُٹھایا اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے بل ان کے تعاقب کو دوڑا۔ قریب تھا کہ بوڑھا ان کو پکڑ کر نارنگیاں چھینتا ایک ظالم نے اپنا تیز آبدار چاقو مالی کے سینہ میں گھونپ دیا۔ اور بوڑھے مالی کا خون آلود جسم خاک پر تڑپ رہا تھا۔

چھوٹا پرندہ جو دنیا کی ہر چیز کو حیرت و تعجب سے دیکھ رہا تھا اس وحشتناک نظارے سے کانپ اُٹھا اور اس کی ماں اُڑتی ہوئی اُس کے قریب آئی اور محبت کے انداز میں اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا کر بولی ——

میرے بچے تو کب تک اس عہد بے فکری میں دلکش راگ گایا کرے گا۔

ننھے پرندے نے سامنے والے روح فرسا نظارے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ماں کیا اس مخلوق کا نام انسان ہے؟

چڑیا نے سہم کر جواب دیا۔ ہاں یہی تو انسان ہیں ——

معصوم پرندے نے آہستہ سے کہا انسان ماں یہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟

نادان بچے انسان سوائے اپنی ذات کے کسی کے خیر خواہ نہیں ہوتے میرے بچے تو اب جا اپنا پیٹ آپ بھر اب اپنا بار خود اٹھانے کی عادت ڈال لیکن یاد رکھ انسان کے دام مکاری سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا۔

چھوٹا پرندہ اُڑتے اُڑتے ایک وسیع کھیت میں پہنچا جہاں دانے (خوراک) کافی مقدار میں بکھرے پڑے تھے۔ وہ نیچے اتر آیا اور سیر ہو کر ایک سعی ناکام کے ساتھ اُڑنا چاہا۔ تو اس کے ننھے ننھے نازک پاؤں کسی چیز سے اُلجھ کر رہ گئے۔ یکایک ایک ڈراؤنے خیال نے اُسے چونکا دیا اور وہ بے اختیار اڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

آخری بار پھر پھڑایا مگر اب وہ جال سے نکل کر اسیر قفس تھا۔ چاندی کا پنجرا قسم قسم کی کٹوریوں سے بھرا تھا۔ جن میں طرح طرح کی غذا پڑی تھی۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ صحبت ناجنس ان انواع واقسام کھانوں کے بجائے اس کا گلا گھونٹ دیتی بے رحم صیاد چاہتا تھا کہ یہ آنکھیں کھولے ان چیزوں کو دیکھے اور میری طرح یہ بھی خوش ہو۔ لیکن وہ خاموش تھا بالکل خاموش۔ وہ سوچتا تھا کہ ہوا افسردگی کے ساتھ میرے چمن میں پھولوں کے پاس سے گزرتی ہوگی پھول میری یاد میں پنکھڑی پنکھڑی ہو کر خاک میں مل گئے ہونگے میرے دوست جن کے ہمراہ میں کالے کالے بادلوں کے نیچے پرا باندھ کر فضا میں رقص کرتا تھا میرے نہ ہونے سے غمگین ہوں گے۔ مگر نہیں باغ

میں ویسی ہی بہار تھی۔ ہوا اُسی شوخ رفتاری سے چلتی تھی حسین پھول ہر روز نئی بہار کے ساتھ کھلا کرتے تھے۔ شبنم بدستور اپنے آبدار موتی اوراقِ گل پر بکھیرا کرتی تھی! اس کی ماں اس کو بھول کر فضا کی رنگینی میں مخمور تھی۔

موسم بہار آگیا۔ خاموش درد اُس کے ننھے دل میں کروٹیں لینے لگا۔ سامنے آسمان پر بہار کے شگفتہ بادل رقص کرتے دکھائی دیتے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں لاانتہا حسرتوں کے نغمے موجود تھے جذبات اور زندگی سے بھرے ہوئے نغمے جن کو وہ چمن کی رنگین اور آزاد فضاؤں میں گانا چاہتا تھا وہ ایک بار صرف ایک بار موسم بہار کی کھلی فضا میں اُڑ کر اپنے باغ میں جانا چاہتا تھا۔ مگر بے رحم صیّاد اُس کے ان جذبات سے ناآشنا تھا۔

شام ہو چکی تھی آسمان پر ارغوانی رنگ کے بادل لہرا رہے تھے۔ اُس کا نقرئی قفس خوشنما مکان کی کھڑکی کے آگے لٹک رہا تھا۔ بہت سے پرندے ہوا میں خوش خوش اُڑ رہے تھے۔ وہ اپنا نغمہ بہار اگر پنجرے کی مضبوط سلاخوں کے اندر گاتا تو آزاد اور مسرور پرندے ایک تمسخر آمیز ہنسی ہنستے اور اُسے بیوقوف سمجھتے۔ جو جان بوجھ کر نادان بن گیا ہو۔ اس لئے وہ خاموش تھا۔ بالکل خاموش یہاں تک کہ اس خاموش درد نے اس کی ننھی سی جان کو سرد کر دیا۔ !!!

عندلیب کی یاد

علم وادب کے چمنستانوں، اخلاق محمدی کے ایوانوں اور رحمت خداوندی کے راحت کدوں سے میری بہن سعیدہ عندلیب پرواز کرگئی جس نے مجھے ان افسانوں کو کتابی صورت میں منتقل کرنے کی تحریک میں حمایت کی تھی۔ مرحومہ کو ایام کمسنی میں ہی مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اُس نے اصلاحی و معاشرتی مضامین سے ابتدا کی تھی۔

افسانے بھی لکھے لیکن ایک افسانہ "سماج کے ستون" ادبی دنیا میں بہت مقبول ہوا تھا۔ میری آرزو تھی کہ میں اس مجموعہ میں مرحومہ کا آخری یادگار افسانہ شامل کرتی۔ لیکن میں اُسے حاصل نہ کرسکی۔ عندلیب کا طرز تحریر سادہ اور دلنشین تھا۔ کسی مسئلہ پر اپنے نظریہ کو پیش کرتے وقت منطق سے کام نہ لیتی۔ بلکہ عینی مشاہدات سے اپنے نظریہ کو ثابت کرتیں۔ آخیر زمانہ زیست میں تخیلات کی پرواز بہت بلند ہوگئی تھی اور "سماج کے ستون" کے پرواز تخیل کے ساتھ عندلیب کی روح بھی پرواز کرگئی۔ مرحومہ انسان نہیں انسان سے افضل ترین تھی۔ اس کی قابلیت جس کا اظہار نہ ہو اُس کی وہ شائستگی جس سے خود کو بھی بے خبری سی تھی، وہ نفاست مذاق

جس میں دکھاوا نہ تھا۔ وہ وقار تمکنت جس میں خلوص ہی خلوص بھرا تھا۔ اُس کا معیار کتنا اُونچا تھا اور کس قدر بلند جب اس کو یہ فضا "پرواز تخیل" کے لئے تنگ اور ناموزوں نظر آئی۔ تو وہ دنیائے ادب کی عندلیب خوش نوا آسمانی رفعتوں میں پرواز کر گئی۔ جہاں اُس کے گرد معصومیتوں کی تمام جاذبیتوں کو آنکھوں میں لئے فردوسی حوریں ایک دلکش قوس وقزح میں خود کو ترتیب دئیے آسمانی نغمے گا رہی ہیں۔ فردوسی فضائیں دلہن بنی ہوئی ہیں۔ تبسّم ہی تبسّم رنگینی ہی رنگینی ہے۔ فرشتوں کے پروں کی لطیف سرسراہٹ ماحول میں وہ کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ جسے راگنی کی مسکراہٹ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور اس تمام ہجوم کے درمیان چشمہ کوثر میں تیرتے ہوئے حسین کنول کی طرح عندلیب بیٹھی مسکرا رہی ہے۔

وہ اُس بستی میں آباد ہے۔ جہاں سکون و سکوت کی دیوی بستی ہے۔ وہ وہاں ہے جہاں غموں کی آہ و بکا کے بجائے مسرّت کے غیر فانی نغمے گونجتے ہیں جہاں لالہ و گلاب کو اپنی ٹہنیوں سے جدا نہیں کیا جاتا۔ جہاں روحیں آزادی کے گیت گاتی ہیں جہاں دوشیزہ فطرت کے کہکشانی آنچل لہرا رہے ہیں۔ جہاں کی معطر فضاؤں سے بے لوث محبت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔

آج میں اپنے افکار و ادب کے مرتب ہونے پر مبہوت ہوں کہ اپنی غمگسار مدبّرہ و منکسرہ ہمشیرہ کو کہاں تلاش کروں تاکہ وہ میری

اسس تالیف وتدوین کو دیکھے۔ میری حوصلہ افزائی کرے۔ اور اپنی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے دیکھ کر مسرور ہو۔ مگر اُس نے موت کا دامن تھام لیا ہے۔ جس میں زندگی کی حسین ندی سنگ ہائے حوادث سے ٹکراتی ہوئی تلاش سکون کے لئے جا گرتی ہے۔ اسس نے زندگی کی پرپیچ پگڈنڈی کو تنہا عبور کر کے اس سرزمین کا راستہ پالیا۔ جہاں کے سایۂ دار درخت فنا کا راگ گاتے ہیں۔ اور مجھے اُسس خزاں رسیدہ پتے کی طرح چھوڑ دیا۔ جو آندھی کے ہاتھوں چمن سے دور تپتی ہوئی ریت پر جا پڑا ہو۔!!

آہ! عندلیب تمہاری شمع احساسات کی آنچ
سے جلتے ہوئے تمہاری دنیا کا راستہ تلاش
کرتی رہے گی۔ سوز سوزِ فرقت سے
مجروح ہے۔ شبنم آنسو بکھیر رہی ہے اور
ثریا آسمانی رفعتوں پر چمکنے والی
ثریا سے تمہارا پتہ پوچھتی ہے
مگر تم وہاں ہو جس کی
تعبیر ہے
کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ